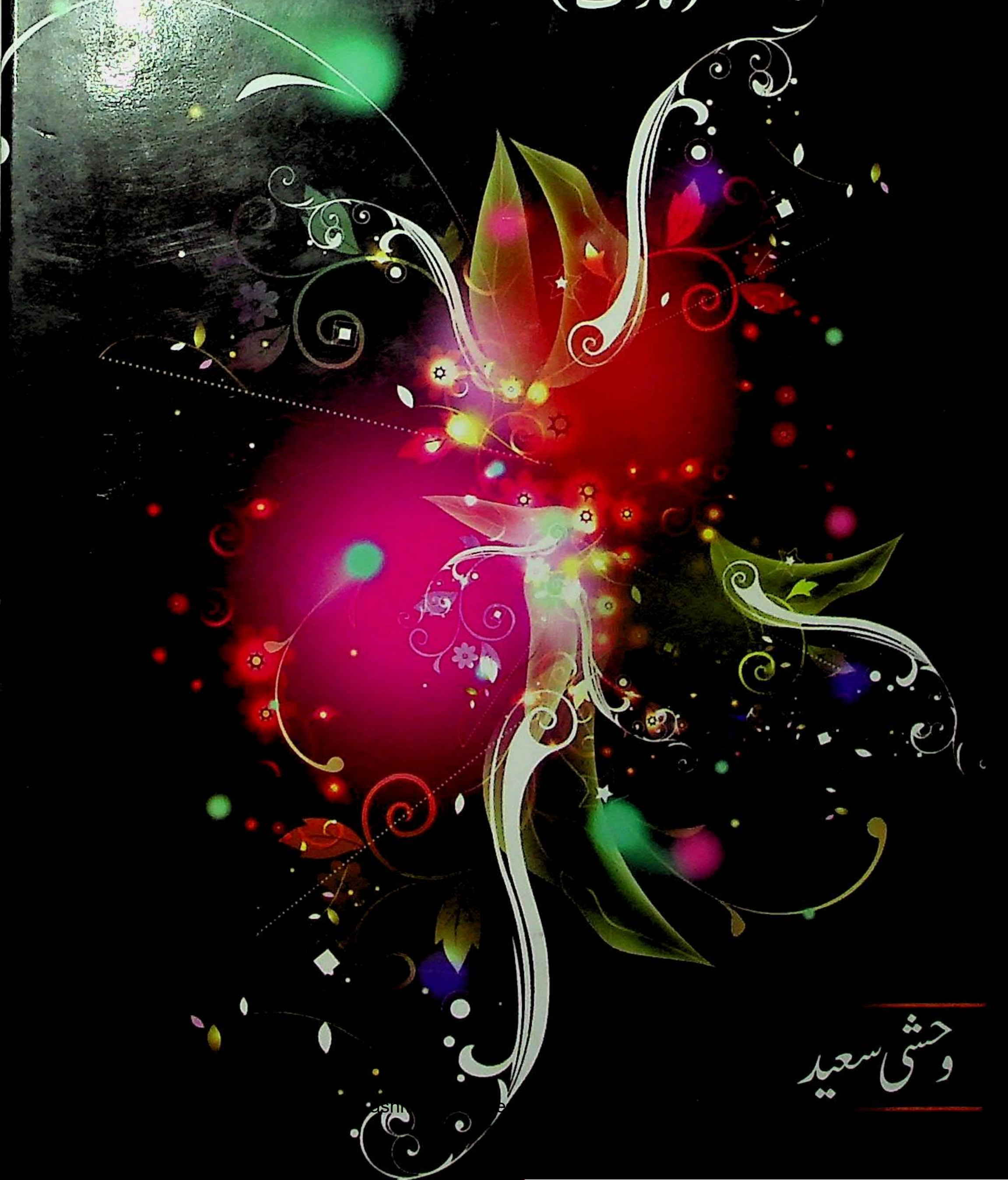
ماضی اور حال

(ناولٹ)



وحشی سعید

MAAZI AUR HAAL

By : Vehshi S

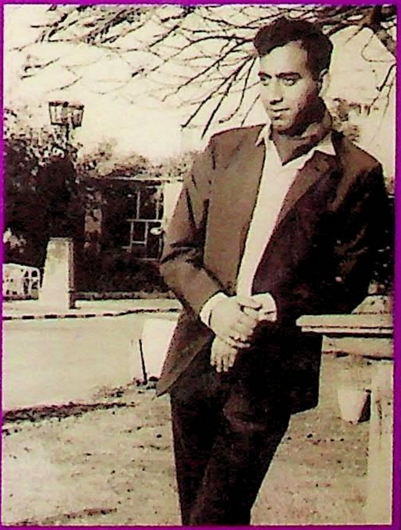
ماضی

اور

حال



2015



1964

Tahreek-e-Adab
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.) INDIA
Cell: 0091 - 993-595-7330
e-mail: jaweanwar@gmail.com

ماضی اور حال

(جلد اول)

(پانچ ناولٹ کا مجموعہ)

وحشی سعید

زیر اہتمام

تحریک ادب

Maazi Aur Haal

By: Vehshi Syed

(Collection of five novelets)

نام کتاب:	ماضی اور حال
مصنف:	وحشی سعید
سرورق:	عظمیٰ اسکرین
طباعت:	مہاویر پریس، وارانسی
کمپوزنگ:	عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837
	e-mail: uzmascreen@gmail.com
سن اشاعت:	۲۰۱۵ء
ضخامت:	۲۳۲صفحات
تعداد:	۵۰۰
قیمت:	۵۰۰/روپے

تقسیم کار:

M. Syed Tramboo (Vehshi Syed)
Hotel Shahenshah Palace
Boulivard Road, Dal Gate, Srinagar-190001 (J&K)
Cell: 09419012800, 09818226116

Jawed Anwar
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata,
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.)
Cell: 09935957330

انتساب

دادا مرحوم

حاجی محمد رمضان ترمبو

کے نام

فہرست

دو لفظ

وقت کس قدر تیزی سے گزرتا ہے اس کا احساس تب شدت سے ہوتا ہے جب بہت کچھ کرنے کی تمنا ہوتی ہے اور وقت کی تنگی کا احساس ہوتا ہے۔ آج جب میں اپنے ابتدائی دور کے افسانوں پر غور کرتا ہوں تو ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء کا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب میں نے ایس. پی. کالج میں بی. اے. میں داخلہ لیا اور میرے ہم جماعت نے اپنے والد کے بڑے افسانہ نگار ہونے کا تذکرہ مجھ سے اس طرح کیا گویا افسانہ نویسی میرے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میں نے بھی پکا ارادہ کیا کہ افسانہ اور ناول لکھ کر رہوں گا۔ اسی جنون میں جو کچھ بھی دماغ میں آتا گیا ان کو رقم کرتا رہا۔ اس طرح ۲۰ سے ۲۲ سال کی عمر کے درمیان یعنی ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء۔ اس وقت بی. اے. چار سال کا ہوتا تھا جس میں ہائی اسکول کے فوراً بعد داخلہ لے سکتے تھے اور پہلا ایک سال .P.U.C کا ہوتا تھا۔ تو میں نے ۱۹۶۴ء میں ایک سال میں .P.U.C پاس کیا۔ اس کے بعد جب ۳؍سال میں میں نے بی. اے. مکمل کیا تو بی. اے کی سند کے ساتھ ساتھ میرے پاس ایک ہزار سے زائد صفحات جو کہ ناول اور افسانوں پر مشتمل تھے میری تخلیقی سند کے طور پر میرے ساتھ تھے کہ میں افسانہ نگار اور ناول نگار بن گیا ہوں۔ گھر میں مجھے انگریزی کا ٹیوشن پڑھانے کے لیے پنڈت رگھوناتھ در صاحب مقرر ہوئے تھے۔ پنڈت رگھوناتھ در صاحب کو انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو، عربی اور فارسی پر بھی خاصا عبور تھا۔ ان کا پڑھانے کا طرز اتنا شگفتہ اور نرم تھا کہ وہ ایک طرح سے میرے دوست زیادہ اور استاد کم تھے۔ میں ان کو اپنے افسانے اور ناول دکھاتا تو وہ میری حوصلہ افزائی کرتے اور مزید محنت کی تلقین کرتے لیکن چونکہ ان کی ذمہ داری انگریزی کی تعلیم تھی اس لیے اردو کے لیے وقت بہت کم مل پاتا۔ پھر بھی ان کی حوصلہ افزائی کے سبب میں نے اپنی ان ۲۰ سے ۲۲ سال کے درمیان کی عمر کی محنت اور ایس. پی. کالج میں بی. اے. کی اس یادگار کو شائع کرا کر ایک

ضخیم کتاب کی شکل دے دی تا کہ میری اس دور کی تخلیقی کاوشیں محفوظ رہ جائیں۔

اردو زبان کی باریکیوں کو جاننے اور سمجھنے کا شرف مجھے کشمیر یونیورسٹی میں حاصل ہوا جہاں میں نے ایم.اے. میں داخلہ لیا اور پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور پروفیسر حامدی کاشمیری میرے اساتذہ تھے اور میرے اوپر ان کا خاص کرم تھا۔ ادھر کچھ دنوں قبل جب میں نے اپنی اسی ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب نکالی تو مجھے جس چیز نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں متاثر کیا وہ ان کا مرکزی خیال تھا۔ زبان اور بے جا واقعات، قصہ پن کی طوالت اور دوسری تمام قسم کی خامیاں جو ایک نو وارد کے افسانوں اور ناولوں میں ہو سکتی ہیں، ان میں موجود تھیں۔ میں نے ان پر پھر سے محنت کی اور تراش خراش کے بعد اس کی جو شکل بنی وہ یہ کہ جو ناول (غم کی رات) ۱۷۱ر صفحات پر مشتمل تھا وہ ۱۲۱ر صفحات تک سمٹ گیا۔ اسی طرح ''منزل اور تلاش''، جس کی ضخامت پہلے ۱۵۰ر صفحات تھی وہ ۴۳ر صفحات تک ہی رہ گئی۔ ''الٹا انسان'' جو کہ ۱۰۴ر صفحات میں لکھا گیا تھا وہ ۶۵ ر صفحات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ''خون اور محبت'' ۱۱۰ر صفحات کا ناول تھا جو ۳۳ر صفحات کا ہو گیا۔ ''قحط'' جو کہ ۱۹۲ر صفحات پر مشتمل تھا ۶۴ر صفحات تک سمٹ گیا۔ اس کے علاوہ پانچ میں سے چار ناولٹ (قحط کو چھوڑ کر) کے عنوان بھی میں نے بدل دیے ہیں۔ پہلے ''غم کی رات'' اب ''عجب زندگی.... غضب موت''، پہلے ''منزل اور تلاش'' اور اب ''جائز...... ناجائز''۔ پہلے ''الٹا انسان'' اور اب ''فطرت.... محبت..... ندامت''، پہلے ''خون اور محبت'' اور اب ''وحشت محبت'' اور ''قحط''۔

اتنی عرق ریزی کے بعد چونکہ ان کی شکل ناول کی نہیں رہ گئی تھی اس لیے میں انہیں ناولٹ کہتا ہوں۔ پانچ ناولٹ پر مشتمل اس مجموعے کا نام بھی اسی مناسبت سے ''ماضی اور حال'' جلد اول رکھا گیا ہے۔ ''جلد اول'' اس لیے کہ اس دور کے دوسرے ناولوں اور افسانوں پر بھی میں تیزی سے کام کر رہا ہوں۔ قوی امید ہے کہ انشاء اللہ ''ماضی اور حال'' جلد دوم بھی رمضان تک مکمل ہو جائے گی۔

وحشی سعید

۱۴ر جون ۲۰۱۵ء، بروز اتوار

سرینگر، کشمیر

عجب زندگی.....غضب موت

(۱)

روشنی بجھادو.....رو.....رو.....شنی

حوالدار کی آواز نے کالی اور اونچی دیواروں سے ٹکرا کر خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔عبدالجبار کی کالی آنکھیں گھنی داڑھی کے پس منظر میں چمک رہی تھیں۔لیکن لگتا تھا کہ یہ چمک بجلی کے بلب کے خراب ہونے سے پہلے کی آئی ہوئی چمک ہو اور جسے ہمیشہ کے لیے کچھ ہی لمحوں بعد بجھ جانا ہو۔

اسے محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ تمہاری زندگی دم توڑ دے گی۔زندگی کا نام سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔حالانکہ اس کا ارتقا اسی لفظ سے شروع ہوا تھا۔جب وہ پیدا ہوا تب زندگی کی شہنائیاں گونجیں۔لیکن اب زندگی سے کتنی دیر کا واسطہ تھا۔جلد ہی اس کا جسم مٹی کی طرح بے جان ہونے والا تھا۔حوالدار اس کے لوہے کے پنجرے کے سامنے سے یہ کہتا ہوا گذرا۔

''روشنی بجھادو۔''

وہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

''روشنی بجھادوں....لیکن کیوں؟.....نہیں نہیں.....رہنے دو ابھی روشنی کو.....''

''تم بہادر آدمی ہو۔ پھر ہمت کا ساتھ کیوں چھوڑ تے ہو۔ پھانسی پر چڑھنا ہے تو ہنستے ہوئے چڑھو۔ دوسروں کو یہ کہنے کا موقع نہ دو کہ تم موت کے نام سے ڈر گئے۔''

''موت۔''

اسے ہنسی آ گئی لیکن اس میں شدید تلخی تھی۔ موت سے وہ کب ڈرا تھا۔ زندگی نے اسے دیا ہی کیا تھا۔ کچھ دنوں کی خوشی کے بعد سلسلے وار غم۔ دکھ اور مصیبتیں۔ اور آج وہ زندگی کی آخری رات جیل کے کالے اندھیروں میں کاٹ رہا تھا۔ زندگی.... ہاں زندگی..... کچھ بھی ہو زندگی پھر بھی پیاری ہے۔ اچانک اس کے خیالوں میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ جیل کی سلاخوں کو کاٹ کر آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ لیکن وہ جیل کی دیواروں کو کاٹ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی انہیں پھاند سکتا تھا۔ وہ چاہنے لگا کہ زندگی کی یہ کالی رات اتنی لمبی ہو جائے کہ اس کی سحر کبھی نہ ہو۔ اس کے سامنے بچپن کا وہ منظر آ گیا جب وہ کھیتوں میں اچھلتا کودتا ندی کے کنارے تک چلا جاتا تھا۔ وہاں اس کی معصوم ساتھی گلابو۔ اس کی منتظر رہتی۔ وہ گلابو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میدانوں، کھیتوں کو پار کرتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ جاتا تو گلابو کہتی۔

''اچھا۔ اب میں جاؤں۔''

''ہاں لیکن کل ضرور ملنا۔''

گلابوں چلی جاتی اور وہ اس کو جاتے ہوئے تب تک دیکھتا رہتا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔

کھردرے ہاتھوں میں ہل بہت اچھا لگتا ہے اور اس پر آدمی کا پسینہ کھیت کے لیے خون بن جاتا ہے۔ عبدالجبار سو کنال کے وسیع و عریض کھیت کا مالک تھا۔ اس کے کھیت میں مزدوری کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی لیکن اس کے اندر کا کسانی خون جوش مارتا تھا اور وہ خود بھی ہل چلاتے ہوئے کھیتی باڑی میں نئے نئے تجربات کرتا رہتا۔ خود کے کھیت میں خود ہل چلانا اس کے روحانی سکون کا باعث تھا۔ وہ اس دھن میں اتنا کھو جاتا کہ خود کو شہنشاہ محسوس کرتا۔ وہ شہنشاہ جو مدہوشی کے عالم میں ہچکولے کھا کر زندگی کا راگ الاپ رہا تھا اور جب اس راگ

میں کسی حسینہ کا ذکر آتا تو اس کی زبان سے نکل پڑتا۔

''گلابو۔''

کل کے معصوم بچے کو گذرتے وقت نے صحت مند خوبصورت نوجوان میں تبدیل کر دیا تھا لیکن اس جوانی نے ان دونوں کو ملنے میں سماجی پابندیاں عائد کر دیں۔ اب انہیں چھپ چھپ کر ملنا پڑتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن نے اس کے خیالوں کو منتشر کیا۔ اس نے بیلوں کو روک کر اپنے بوڑھے ملازم سے پوچھا۔

''کاکا۔ وقت کیا ہوا؟''

''دوپہر ہونے کو آئی۔''

''دوپہر..... پھر تو مجھے جانا چاہیے۔''

پسینہ عبدالجبار کی سرخ چمڑی پر چمک رہا تھا۔ اس نے کھیت کے پاس والی ندی میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور گھر کی جانب روانہ ہوا۔

اچھے خاصے گھر کے باہر اچھا خاصا باغ بھی تھا۔ یہاں اس کے والد کسی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ باپ کی نظروں سے بچتا ہوا وہ گھر میں داخل ہوا۔

''امی''

امی نے شفقت بھری نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''کیوں، تم آج پھر کھیت پر گئے تھے۔''

''گیا تھا۔''

''کیوں''

''امی مجھے ہل بڑا پیارا لگتا ہے۔''

''بیٹا تمہاری یہ منطق مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ جو کام تم وہاں جا کر کرتے ہو وہ کام دو روپئے میں مزدور بھی کر سکتا ہے۔ تم بڑے گھر کے چشم و چراغ ہو۔ خاندان کی عزت کا بھی خیال رکھو۔ تمہارے والد سنیں گے تو خفا ہوں گے۔''

''امی۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ آج کے دور میں جب تک آدمی کے بازوؤں میں

دم ہے تب تک دنیا اس کے ساتھ چلتی ہے۔ خیر چھوڑو۔ اس وقت پیٹ میں چوہے کودرہے ہیں۔ کچھ کھانے کو دو۔ مجھے ضروری کام سے نکلنا ہے۔

کھانا کھا کر وہ چاگر نامی پہاڑ کی جانب چل پڑا۔ یہ پہاڑ ایک طرح سے اس کا دوست تھا۔ بچپن کا دوست جو اس کے بچپن کی معصوم دوڑ، ایک ایسی دوڑ جس میں جنون ہوتا ہے کا چشم دید گواہ تھا۔ جوانی کی دوڑ ایک ایسی دوڑ جس میں جذبۂ شوق ہوتا ہے۔ منزل تک پہنچنے کا شوق۔ اس کو پالینے کی خواہش۔ وہ اس دوڑ میں عبدالجبار کا شریک تھا۔

چاگر پہاڑ پر پہنچنے کے بعد اس نے پکارا۔

''گلابو۔''

گلابو کے چہرے پر انتظار کی شکن تھی۔

''یہ کیا ہم دوڑتے ہوئے آئے اور تم منھ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تو میرا کیا ہوگا۔ میرے لیے تو یہ کائنات بے کار ہو جائے گی۔ میرے لیے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

گلابو کی آواز پر اعتماد تھی۔ ایسا اعتماد جس میں ہلکہ سا خوف موجود ہوتا ہے۔

''بہت انتظار کرایا۔''

''کھیت میں کام کررہا تھا کہ تمہاری یاد میں کھو گیا اس لیے تھوڑی دیر ہوگئی۔ معاف کر دو۔''

''معاف کیا''

گلابو کے حسین چہرے پر دلفریب تبسم پھیل گیا جس میں عبدالجبار ڈوب گیا۔

''گلابو، تم بہت خوبصورت ہو۔''

''اچھا...آ......آ.....''

گلابو کی اس دلبرانہ ادا نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اس نے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔

''گلابو.....تمہارے لیے میں ایسا گھر بناؤں گا جس کے ہر کمرے میں ریشمی قالین بچھے ہوں گے۔ وہ گھر دنیا بھر کے نادر و نایاب چیزوں سے سجاؤں گا۔ جو بھی ہمارے گھر آئے گا وہ حیران رہ جائے گا۔''

''مجھے تمہارے سونے چاندی سے بنے ہوئے گھر میں جگہ نہیں چاہیے، تمہارے دل میں جگہ چاہیے۔ تم میرے پاس رہو، میں تمہارے پاس رہوں۔ بس، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میں روکھی سوکھی کھا کر بھی تمہارے ساتھ زندگی گذار دوں گی۔ میرے جبار یہ دنیا بہت بری ہے۔ روپیہ کمانے کے لیے کوئی غلط راہ مت اپنانا۔ وہ اپنا پڑوسی صمد خان ہے نا.....''

''ہاں کیا ہوا اس کو؟''

''اس کا ایک جوان بیٹا یوسف ہے۔''

''یوسف!''

''ہاں وہ مجھے عجیب نظروں سے گھورتا ہے۔''

''وہ دیکھو کوئی ہماری طرف آ رہا ہے۔''

''چلو بھاگو۔''

وہ دونوں پہاڑ کی جھاڑیوں کی اور جانے لگے کہ یوسف کی خوفناک آواز نے فضا پر لرزہ طاری کر دیا۔

''سور کی اولاد بھاگ کے کہاں جائے گا؟''

خون پر اگر طنز کیا جائے تو نحیف اور کمزور بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جبار غصے میں اس آواز کی جانب لپکا۔

''جانے دو جبار۔ یوسف کمینہ ہے۔ اس کے ساتھ جھگڑا مت مول لو۔ تم اس کو نہیں جانتے۔'' گلابو گھبرا اٹھی۔

''گلابو۔ تمہارا مطلب ہے کہ گالی سننے کے بعد بھی میں بزدلوں کی طرح بھاگ جاؤں۔ نہیں گلابو میں بزدل نہیں۔''

جبار جھاڑیوں سے باہر آیا۔ یوسف بھی اس کے نزدیک آ گیا تھا۔ جبار چیخ پڑا۔

''زبان کو لگام دو ورنہ۔''

یوسف کی آنکھیں غصے کی شدت سے سرخ ہوگئی تھیں۔

''کمینے گاؤں کی لڑکی کو ورغلاتا ہے۔ کیوں نہیں۔ تیری رگوں میں نیچ کا خون جو ٹھہرا۔''

جبار کا خون کھول اٹھا۔ اس کا ہاتھ فضا میں اٹھا اور بجلی بن کر یوسف پر پڑا۔ دونوں آپس میں الجھ گئے۔ جبار لمبا چوڑا صحت مند آدمی تھا لیکن یوسف بھی گاؤں کی کشتی ٹیم کا کھلاڑی تھا۔ وہ ہنر یہاں کام آیا۔ اچانک جبار کو محسوس ہوا کہ آسمان گھوم رہا ہے۔ اس کا سر ایک پتھر سے ٹکرا کر لہولہان ہوگیا۔ خون آلود چہرا دیکھ کر گلابو چیخ پڑی۔

''جبار''

''خاموش لڑکی۔ اس کمینے کو میں پنچایت لے جاؤں گا، وہاں اس کا فیصلہ ہوگا۔ اس کو اور اس کے باپ کو ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔''

گلابو نے خود پر قابو پایا۔ وہ جانتی تھی کہ پنچایت کا سامنا اس کے لیے بھی مناسب نہیں ہوگا۔

''نہیں یوسف تم ایسا نہیں کرو گے۔''

''چل میرے ساتھ۔''

گلابو نے زخمی جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیسے جا سکتی ہوں۔ جبار بے ہوش پڑا ہے۔ میں کیسے اس کو اکیلا چھوڑ دوں۔''

''اچھا تو پھر میں پنچایت کو یہیں بلاتا ہوں اور اس سور کے کارنامے کو دکھاتا ہوں۔''

یہ ترکیب کام کر گئی۔ گلابو کو مجبوراً جبار کو وہیں اسی حالت میں چھوڑنا پڑا۔ یوسف نے اس کے گھر پہنچتے ہی قہر برپا کر دیا۔

''جناب آپ یہاں خدا کی عبادت میں محو ہیں اور آپ کی بیٹی آپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس لفنگے جبار کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ اس لڑکی کی لگام کیسے۔''

اسی درمیان گلابو کی ماں بھی آ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا۔''

یوسف نے قصہ بیان کیا۔لیکن اس میں سچ سے زیادہ جھوٹ شامل تھا۔شاید اس لیے کہ کچھ دن پہلے ہی گلابو سے اس کے رشتے کی بات چلی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ غور کررہا تھا کہ ایک مخصوص وقت گلابو گھر سے غائب ہو جاتی تھی۔آج اس نے گلابو کا تعاقب کیا اور اصل بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

گلابو کا والد اس کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''بیٹا ممکن ہے کہ آج کی میری یہ عزت کل کو تمہاری عزت بن جائے۔اس لیے

......

یوسف نے اس کی بات بیچ سے کاٹ دی۔

''اسی لیے تو اب تک خاموش ہوں لیکن اب اس کا علاج بہت جلد ہونا چاہیے۔''

''لیکن وہ علاج ہے کیا؟''

''آپ گلابو اور میری شادی بہت جلدی کر دیجیے۔''

''بیٹا یہ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی لیکن تمہارے والد.....وہ اتنی جلدی شادی کو مان جائیں گے۔''

''یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔آپ شادی کی تیاری کیجیے۔''

یہ کہہ کر یوسف نے ان سے اجازت لی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جس میں انتقام کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔

(۲)

جبار کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے سر کو خون سے لتھ پتھ پایا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے جسم میں طاقت ہی نہ ہو۔ کسی طرح وہ حکیم کے پاس پہنچا۔ حکیم نے مرہم پٹی کی اور ہدایت دی کہ کم از کم دو دن مکمل آرام کرے۔ جیسے تیسے وہ گھر پہنچا۔ ماں دوڑتی ہوئی آئی۔ بیٹے کا حال دیکھ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''بیٹا یہ کیا؟''

جبار نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کچھ نہیں امی۔ معمولی چوٹ ہے۔''

''لیکن یہ چوٹ آئی کیسے؟''

''امی اندھیرے میں گر پڑا اور سر پتھر سے ٹکرا گیا۔''

''سچ بول رہا ہے۔''

''اور نہیں تو کیا۔''

''اچھا آرام کرو۔ میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔''

امی کھانا لانے چلی گئیں۔ جبار کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ واقعات پھرنے لگے۔ وہ چیخ پڑا۔ ''یوسف میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' لیکن وہاں اس کی چیخ سننے والا کوئی نہ تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہیں صحت یاب کیا۔ دو دن بعد آج تم نے آنکھیں کھولیں۔'' والد نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔

تیسرے دن وہ کافی اچھا ہو گیا تھا۔ اس کا دل گلابو سے ملنے کو بیتاب تھا۔ تین دن.....نہ جانے گلابو کا کیا حال ہو گا۔

''امی میں کھیت پر جا رہا ہوں۔''

''بیٹا حکیم صاحب نے ابھی تمہیں زیادہ چلنے پھرنے کو منع کیا ہے۔''

''بس امی کھیت تک جاؤں گا اور دس منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔''

وہ کھیتوں سے ہوتا ہوا چاگر پہاڑ پر جا پہنچا۔ کافی دیر بیت گئی لیکن....

''گلابو ابھی تک کیوں نہیں آئی۔''

دور سے شہنائی کی مدھر آواز آ رہی تھی۔ کسی کی بارات اس جانب آ رہی تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ خوشی کا یہ قافلہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ دولہا سفید گھوڑے پر سوار تھا۔

''یہ تو یوسف ہے۔''

دوسرا سوال اس کے دماغ میں آیا۔

''کس کے ساتھ اس کی شادی ہو رہی ہے۔'' یہ جاننے کے لیے وہ ایک باراتی کے پاس پہنچا۔

''گلابو کے ساتھ۔''

شہنائیوں کے مدھر راگ اس کا مزاق اڑا رہے تھے۔ گلابو چلی گئی۔ وہ تھکے قدموں سے گھر واپس لوٹا۔

''کیا ہوا بیٹا۔ تمہارا چہرا پیلا کیوں پڑا ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں امی۔ شاید تھکاوٹ کے سبب۔''

''اچھا۔ ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے۔ شہر کے ایک بڑے خاندان سے تمہارے رشتے کی بات آئی ہے۔''

''ٹھیک ہے امی۔ جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔''

(۳)

وقت نے کب کس کو مہلت دی ہے۔ ہمیشہ اپنی چال چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زندگی کے مصنوعی رنگ جو کہ نئے نئے چمکدار اور دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ دھیرے دھیرے پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔

آج جبار دولہا بنا ہوا تھا اور اپنی دلہن کو لے کر آ رہا تھا۔ حجلۂ عروسی میں اس کے جذبات بے قابو ہو گئے۔

''نسرین''

دلہن خاموش رہی۔

اس نے دلہن کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''کچھ بولو۔ اب تو ہمیں اکٹھے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کا سفر طے کرنا ہے۔''

نسرین نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ شہر کی لڑکی تھی اس لیے شہر کی فضا اس کے دماغ میں رچی بسی تھی۔

''گاؤں میں بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ بجلی کا نظام بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ دیکھئے، کتنا چھوٹا کمرہ ہے۔ کتنی گرمی ہے۔ بجلی بھی نہیں ہے جو پنکھا چلے۔ آپ کل ہی مرے ساتھ شہر چلئے۔ وہاں کی چہل پہل میں مردہ آدمی بھی زندہ ہو جاتا ہے۔''

جبار کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ لیکن اس نے ضبط کیا۔

''میری پیاری دلہن آؤ ابھی سب کچھ بھول کر ایک دوسرے میں سما جائیں۔''

لیکن میں کیسے اس بند ماحول کو بھول جاؤں۔ ایسے......''

جبار نے اس کی باتوں کے پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے لبوں پر لب رکھ دیے جس سے اس کی احتجاج بھری آواز دب گئی۔ اسی وقت بجلی بھی آ گئی۔

نئی زندگی کی نئی باتوں کے درمیان نسرین نے اپنے شہری جذبات کو قابو میں رکھا۔ لیکن کچھ دن بیتنے کے بعد اس نے بغاوت شروع کر دی۔ اس کا گھر سر پر اٹھا لینا گھر والوں کے لیے روزمرہ کا معمول بن گیا۔ اس کا برا اثر روزی پر بھی ہوا۔ جلد ہی ان کو مفلسی نے آ گھیرا۔ گاؤں کی زندگی اور دن بہ دن بڑھتی ہوئی مفلسی سے تنگ آ کر آخر کار ایک دن نسرین نے اعلان کر دیا۔

اس گھر میں میری زندگی اجیرن بن گئی۔ میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی۔ مر جاؤں گی۔ کہاں وہ شہروں کی رونق، کہاں کلبوں کی چمکتی ہوئی روشنیاں اور ہنگامہ بھری ہوئی زندگی۔ کہاں وہ کاروں میں بیٹھ کر ایک دنیا گھوم آنا اور یہاں۔ چار گھنٹے بجلی اور پھر باہر بیٹھ کر کھیتوں کو دیکھنا۔ بس دیواروں کو تکتے رہنا۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں....تم شہر چلو میرے ساتھ۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''تو پھر....تو پھر میرے لیے گھر میں ایک جنریٹر اور ایک کار چاہیے تا کہ میں گاؤں سے باہر بھی گھوم پھر کر آ سکوں۔''

''اتنے روپئے کہاں سے آئیں گے۔ تم تو جانتی ہو، اب ہمارے پہلے سے دن نہیں رہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں اتنا روپیہ کمانے کی قوت نہیں ہے۔''

''قوت....'' جبار چلا اٹھا۔

''تم میری قوت دیکھنا چاہتی ہو۔ میں تمہارے سامنے دولت کا انبار لگا سکتا ہوں۔''

نسرین نے سکون سے کہا۔

''کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔''

''ٹھیک ہے جب تک میں اتنی دولت نہ کما لوں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ جب غصہ کم ہوا تو اس کو یہ حقیقت سمجھ میں آ گئی کہ وہ زندگی بھر بھی ہل چلاتا رہے گا تو بھی اتنی رقم نہ بچا سکے گا۔ ان سب چیزوں کے لیے کم از کم ایک لاکھ روپئے کی ضرورت ہے۔

ایک لاکھ روپئے۔

وہ اپنے آپ میں بڑبڑاتا رہا۔ ایک جواری نے اس کے دماغ کو منتشر کیا۔

''ایک لاکھ کیا ہیں یہاں پچاس روپئے لگانے پر اگر قسمت ساتھ دے تو آدمی لکھ پتی بن جاتا ہے ورنہ پچاس روپیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔''

''چلو ہم بھی قسمت آزماتے ہیں۔''

واقعی آج جبار کی قسمت زوروں پر تھی۔ پچاس روپئے کے ایک ہزار ہو گئے۔ اس کیفیت نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ پھر یادوں میں کھو گیا۔

''کہاں کھو گئے۔''

مونچھوں والے آدمی نے اسے ہلایا۔

''ہاں کھو گیا تھا۔''

''لیکن تاش کے پتوں میں اس طرح نہیں کھو جاتے۔ تم تاش بہت اچھا کھیلتے ہو۔ اگر تم میرے ساتھ آ جاؤ تو.....''

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''چاہتا تو بہت کچھ ہوں۔ لیکن پہلے تم اپنا نام بتاؤ۔''

''میرا نام جبار ہے۔''

''میں سلیمان ہوں۔ اب بتاؤ تم اتنے سنجیدہ کیوں لگ رہے ہو۔''

''چھوڑو یار تم مجھے دیوانہ سمجھو گے۔ تم تو کیا دنیا میں کوئی بھی میری بات سن کر مجھے دیوانہ سمجھے گا۔''

''جب دوست کہا ہے تو بتا دو یار۔ ہم بھی تو دیوانگی کے فلسفے کچھ کچھ ہی سہی مگر سمجھتے

ضرور ہیں۔''

جبار اس کی اس بات سے متاثر ہوا اور اپنی زندگی کے شادی والے پہلو کو کھول دیا۔

''اب بتاؤ میں ایک لاکھ روپئے کس طرح اکٹھا کروں گا۔''

''میرے دوست بازوؤں میں اتنی طاقت بھلے نہ ہو لیکن دماغ میں ضرور اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ناممکن کو ممکن بنا سکے۔''

''کیا کوئی ایسی ترکیب ہے۔''

''ہاں لیکن اس کے لیے ہمت اور حوصلہ چاہیے۔''

''تم ہمت کی بات کر رہے ہو۔'' جبار نے اپنے لمبے چوڑے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بازوؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاتھی کتنا طاقت ور ہوتا ہے لیکن خالی الذہن ہونے کے سبب اس کی طاقت بے سود ہے۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''میں جلد ہی تم سے ملوں گا اور پھر بتاؤں گا۔ آج رات چاگر پہاڑ پر ملنا کیسا رہے گا؟''

''میں انتظار کروں گا۔''

جبار خوش خوش واپس اپنے کھیت کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا کبھی ہمارا کھیت بھی سونا پیدا کرے گا؟''

اس کا بوڑھا ملازم کسی دوسرے سے بات کر رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے کاکا۔''

بیٹا احمد کہتا ہے کہ آج کل گاؤں میں پولیس گھوم رہی ہے۔''

''کیوں؟''

''شاید ہمارے گاؤں میں جوئے کا کھیل شہر سے بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔ کچھ شہر کے لوگ بھی ہمارے گاؤں کی جانب برابر آتے دیکھے گئے ہیں۔'' احمد نے جبار کی بات کا جواب دیا۔

جبار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔اس نے کاکا سے کہا۔

''کاکا گھر پر کہہ دینا کہ مجھے کچھ کام ہے اس لیے میں دیر سے گھر آؤں گا۔''

وہ چاگر پہاڑ کی جانب روانہ ہوا۔ وہ پہاڑ جس نے اس کی خوشیوں کے نظارے دیکھے تھے اوراس کی بربادی کا گواہ بھی تھا۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑکنے لگا جیسے وہ چوری کرنے جارہا ہو۔ پھراس نے خود کو تسلی دی۔

''میں تو کاروبار کرنے جارہا ہوں۔''

وہاں، دو سائے پہلے سے موجود تھے۔ان میں ایک سلیمان تھا۔

''آ گئے تم۔''

''ہاں''

''یہ کون ہے؟''

''یہ اکرام ہے۔ بہت بڑا غنڈہ۔''

''غنڈہ''

جبار کا دل لرز اٹھا لیکن سلیمان نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔

''اکرام بھی ہماری مہم میں شریک ہوگا۔''

''کس مہم میں۔''

''وہ مہم جو تمہیں ایک لاکھ روپئے سے بھی زیادہ روپئے دلائے گی۔''

''لیکن کس طریقے سے.....''

اکرام پہلی بار بول پڑا۔اس کی آواز قدرے خوفناک تھی۔

''استاد، اسے شریک مت کیجیے۔ یہ کام بگاڑ دے گا۔''

''تم خاموش رہو۔ دیکھو پیارے جبار اتنے روپئے چٹکی بجانے سے حاصل نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ایسا نسخہ ضرور ہے جس سے تم چٹکی بجا کر حاصل کر سکتے ہو۔ وہ نسخہ ہے تحصیل کا خزانہ۔اس خزانے میں روپیوں کا انبار پڑا ہوا ہے۔اب.....''

''یہ تو چوری ہوئی۔''

اکرام یہ بات نہ سہہ سکا اور ایک بھرپور گھونسہ جبار کے پیٹ پر مارا۔ وہ ابھی اس کے گھونسے کا درد سہہ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک گرجدار آواز فضا میں گونجی۔

''ہینڈز اپ۔ مشورے بہت ہو چکے۔ پولیس نے تم تینوں کو گھیر لیا ہے۔ اگر کسی نے بھاگنے کی جرأت کی تو اس کو گولی ماردی جائے گی۔''

''لیکن ..... میں چور نہیں ہوں۔''

تھانے دار نے منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ''بدمعاش تھانے دار یوسف سے جھوٹ بول رہا ہے۔''

''یوسف''، جس نے اس کی دنیا لوٹ لی تھی۔ جو اس بات پر تلا ہوا تھا کہ اس کو برباد کر کے ہی دم لے گا۔

یوسف نے ایسا ہی کیا۔ اس نے سلیمان اور اکرام سے کہلوایا کہ خزانہ لوٹنے کا منصوبہ اس کا تھا۔ حالات کچھ ایسے بنے کہ اس کی امی بھی اسے چور سمجھنے لگی۔

''بیٹے مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

جبار لاکھ دہائی دیتا رہا لیکن ہوا وہی جو یوسف چاہتا تھا۔ چار دن کی طویل بحث کے بعد جج نے فیصلہ سنایا۔

''دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ملزم جبار شیخ ولد اصغر شیخ نے شہر کے دو نامی غنڈوں کے ساتھ مل کر ناگر تحصیل کا خزانہ لوٹنے کی ناکام کوشش کی۔ ملزم جبار شیخ کو اس سنگین جرم کے لیے چھ ماہ قید سخت کی سزا دی جاتی ہے۔''

تین ماہ کے بعد اس کا بوڑھا ملازم اس کو جیل میں ملنے آیا۔

''کاکا کیسے آئے؟''

بیٹے میں تمہاری خیر و عافیت پوچھنے آیا ہوں۔ کیسے ہو؟''

''زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ معلوم نہیں کل کیا ہوگا۔ تم سناؤ گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔''

''بیٹا.....ناگر گاؤں میں پہلی بار ایک طلاق ہوئی ہے۔''

جبار حیران رہ گیا۔

''یہ کون بدنصیب لڑکی ہے؟''

''گلابو''

''گلابو''

''ہاں بیٹا لیکن گلابو ایک حساس لڑکی تھی۔ وہ ذلت کی زندگی برداشت نہیں کر سکی اور اس دنیا سے چلی گئی۔''

''کاکا.....''

اس کے بعد اس کی زندگی میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو سمندر میں طوفان کے پہلے آتی ہے۔

ہو سکتا ہے یہ خاموشی تہذیب یافتہ لوگوں کی شرافت کی علامت ہو۔ لیکن اس کے اس نئے انداز نے جیلر کو ضرور متاثر کیا تھا۔ اس لیے اس کی ایک ماہ کی سزا کم کر دی گئی تھی۔ جیلر جبار سے کہہ رہا تھا۔

''جبار اب تم آزاد ہو۔ اب ایک اچھے آدمی کی طرح زندگی بسر کرنا۔''

''جیلر صاحب۔ یوں تو مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اب تو دن کاٹنے ہیں۔ کوشش کروں گا کہ اچھے آدمی کی طرح کاٹ سکوں۔''

''اپنا سب کچھ لے لیا۔''

''جی ہاں''

''کل ہی تمہارے نام ایک خط آیا ہے۔ یہ بھی لے لو۔''

''شکریہ''

وہ جیل سے باہر آزاد فضا میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ جیب میں تھا۔

''خط.... کس کا خط ہوگا؟''

یہ خط ایک سرکاری ملازم کا تھا اور اس عدالت کا لکھا ہوا تھا جس نے کبھی اس کو جیل

کے پنجرے میں ڈال دیا تھا۔

''تم کو عدالت یہ اطلاع دیتی ہے کہ تمہاری بیوی نسرین ولد شیخ جمال نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمہارا چال چلن خراب ہے۔ اس بنیاد پر اس نے عدالت سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کو طلاق چاہیے۔ عدالت نے معقول شہادت پانے کے بعد محترمہ نسرین کی طلاق کی درخواست منظور کر لی۔ اس لیے آج سے تمہارا کوئی بھی اور کسی بھی قسم کا رشتہ محترمہ نسرین کے ساتھ نہیں ہے۔''

جبار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چلو یہ قصہ بھی پاک ہوا۔'' اب اسے اپنے پیارے والدین کی یاد آئی۔ وہ گاؤں کی جانب چل پڑا۔ لیکن اسے امی کا جملہ یاد آیا۔

''مجھے تم کو اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

اس کے قدم رک گئے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ نئی زندگی شروع کرنے کا تھا۔

''لیکن کیسے؟ کہاں سے؟ کس طریقے سے۔''

اسی ادھیڑ بن میں وہ چلا جارہا تھا۔ انجان راستے سے انجان منزل کی جانب.....

کافی دور چلنے پر اسے ایک بھکاری ملا۔ لیکن اس نے ہاتھ پھیلانے سے پہلے اس سے پوچھا۔

''کہاں جارہے ہو؟''

''زندگی سے دور۔ خود سے دور۔''

''کہاں تک بھاگو گے؟''

اس سوال نے بھکاری کو فلسفی میں تبدیل کر دیا۔ وہ رک گیا۔

''کیا کوئی راستہ ہے؟''

''ہاں راستہ بھی اور منزل بھی۔''

''کہاں''

''چلو میرے ساتھ''

''مکان والو.... کہاں ہو تم.... ایک پاگل بھکاری تم کو یاد کرتا ہے۔ ایک ایسا بھکاری

جس کی سب کو ضرورت ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی باہر آیا۔

''کیوں آج تو پھر آ گیا؟''

''آ گیا۔''

''کل ہی تو تجھے ۵ روپئے دیے تھے۔''

''لیے تھے اور اس کے بدلے کچھ دینے آیا ہوں۔''

''اس آدمی نے زندگی میں بہت چوٹیں کھائیں ہیں۔ بوڑھے نے جبار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے پاس رکھ لو۔''

بوڑھے نے جبار کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خدمت میں ہی عظمت کا راز چھپا ہوا ہے۔''

(۴)

وہ نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا۔ یہاں رنگین عشق کے کھوکھلے خواب نہیں تھے۔ ایک نصب العین تھا۔ یتیم خانے میں بے سہارا بچوں کی خدمت۔ یتیم خانے کے بچے بھی اس کو چاہنے لگے تھے۔

بوڑھے کے آخری دن قریب آ گئے تھے۔ اس لیے اس نے اپنی وصیت میں یتیم خانے کا سربراہ جبار کو بنا دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد بوڑھا اس جہاں فانی سے چلا گیا۔

جبار یتیم خانے کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے لگا۔ ایک دن اس نے دفتر کے ایک کونے میں بندوق دیکھی۔

''یہ کس کی بندوق ہے۔''

''جی یہ بابا کی بندوق ہے جو وہ شکار کے لیے استعمال کرتے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ اسے صاف کر کے وہیں رکھ دو۔''

ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ چپراسی نے آ کر کہا۔

''جناب ایک میاں بیوی آپ سے ملنے آئے ہیں۔ شاید وہ لوگ کسی بچے کو گود لینا چاہتے ہیں۔''

''ان کو اندر بھیج دو۔''

جب دونوں اندر آئے، جبار کے ہوش فاختہ ہو گئے۔

''نسرین اور یوسف۔''

''جناب یہ میری بیوی نسرین ہے۔ ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے لیکن اب تک اولاد کے لیے ترس رہے ہیں۔ اب ہم ایک بچے کو گود لینا چاہتے ہیں۔''

''پانچ سال۔ایک لمبی مدت۔دنیا تبدیل ہوئی ہوگی!!!''

''ہماری اندھیری زندگی کو روشنی کا چراغ دے دیجیے۔''

''کس کے پاس آئے ہو تم لوگ۔اس کے پاس جس کی جھولی میں تمہارے لیے انتقام کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

اس کی آواز خوفناک تھی۔یوسف کو چاگر پہاڑ کی وہ آواز یاد آئی جس کی وجہ سے اس نے گلابو سے شادی کی تھی اور پھر اپنا انتقام لینے کے بعد اس کی زندگی تباہ کر کے طلاق دے دیا تھا۔

''جبار''

اسی درمیان جبار نے بابا کی کونے میں رکھی ہوئی بندوق اٹھالی۔

یوسف گڑگڑانے لگا۔

''مجھے چھوڑ دو۔مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا۔پھانسی کا تختہ۔میں تمہیں دولت سے مالا مال کر دوں گا۔میری جان بخش دو۔''

''میں اپنے اوپر ہوئے ظلم کو معاف کر سکتا ہوں۔لیکن گلابو کے قاتل کو....کبھی نہیں۔''

بندوق نے شعلہ اگلا۔یوسف کچھ دیر تڑپنے کے بعد لاش میں تبدیل ہو گیا۔

بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔اسے ایسا محسوس ہوا کہ برسوں بعد اس کی روح کو سکون مل رہا ہو۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

یہ نسرین کی آواز تھی۔اس نے جبار کے ہاتھ سے گری ہوئی بندوق اٹھالی تھی۔

''اگر تم اپنا انتقام لے سکتے ہو تو کیا میں تم سے اپنے شوہر کی موت کا بدلہ نہیں لے سکتی؟''

''ضرور۔لیکن یہ یاد کر کے کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ کس کی وجہ سے ہوں۔''

نسرین کو سارے واقعات یاد آنے لگے۔پہلی بار اس کی روح نے اس کے موقع

پرست اور مطلبی ذہن پر قابو پایا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

جبار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جاؤ چراغ کو روشن کرو۔"

پولیس نے جبار کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ بھری عدالت میں جج نے اس کو وحشی مجرم قرار دیا۔ اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔

یہ اس کی عجب زندگی کی آخری رات تھی جس میں غضب ناک موت سے خوف کھانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بے مقصد زندگی سے چھٹکارا پانے کی مسرت میں جاگ رہا تھا۔

"سورج کب نکلے گا۔ یہ رات کب ختم ہوگی۔"

حوالدار کی آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی۔

"سو جاؤ اب۔"

"وہ سو گیا۔ گلابو اپنی دونوں بانہیں پھیلائے ہوئے اس کے قریب آرہی تھی اور وہ اس کی بانہوں میں بانہیں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"سورج نکل آیا۔"

لیکن وہ اس نئی صبح کو نہ دیکھ سکا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"عجب زندگی۔ غضب موت۔"

جائز......نا جائز

(۱)

انقلاب ایک طوفان ہے اور اس طوفان کو برپا کرنے کے لیے ہمیشہ جرأت و جوش اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر غلام قوم انقلاب کے نعرے کو بلند کر کے سامراجیوں کے بندھنوں کو توڑ کر ایک آزاد فضا میں سانس لینے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ سر تن کی بازی لگا کر، رنگ نسل اور مذہب سے اوپر اٹھ کر کیونکہ آزادی ہر قوم، ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

انقلاب.............زندہ باد

انور خان کے نعرے کا جواب بہت زور شور سے دیا گیا۔ جلوس آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ پولس آ گئی اور لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ طالب علموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس بھاگ دوڑ میں انور خان ایک برقعہ پوش خاتون سے ٹکرا گیا۔

''اندھے ہو کیا؟''

آپ دیکھ رہی ہیں کہ......

برقعہ پوش کے ساتھ جو دوسری عورت تھی، بول پڑی۔

''نواب صاحب تیز گھوڑے پر سوار ہیں۔''

لیڈر جو ٹھہرے۔ تقریر اچھی کرتے ہیں۔

''ذرہ نوازی کا شکریہ!''

''ذرہ نوازی.....؟......خاک''

''آپ جیسے لوگ صرف بولنا جانتے ہیں۔''

انور خان مایوس گھر کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے والد کے انتقال کو دس سال ہو چکے تھے جو کہ فوج میں میجر تھے اور کسی مہم میں شہید ہو گئے تھے۔ اب صرف ماں تھی اور اچھی خاصی جائداد۔

گھر کے دروازے پر شیر علی نے کہا۔

''آپ کی امی یاد کر رہی تھیں۔''

''اچھا''

''امی حضور، آپ نے مجھے یاد کیا۔''

امی کے سامنے سونے کے چند زیور تھے۔

''ہاں بیٹا، آپ اب تک کہاں تھے۔''؟

''وہ امی آج کالج کے طالب علموں کے جلسے میں تقریر تھی، اس لیے تھوڑی دیر ہو گئی!''

''بیٹا مجھے بتاؤ کہ آپ یہ لیڈری کب چھوڑیں گے؟''

''جب ملک آزاد ہوگا۔''

بیٹا میں آپ کے گھر کو بسانے کی فکر میں ہوں۔ آپ کے لیے ایک خوبصورت لڑکی دیکھ لی گئی ہے اور اس کے ساتھ آپ کی سگائی ہو رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ جلد ہی آپ کا گھر بس جائے۔ نہ جانے میری آنکھیں کب بند ہو جائیں۔''

''ایسی باتیں نا کریں امی، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

''اچھا کل آپ کہیں نہیں جائیں گے، آپ کی سگائی ہے۔''

''امی، اس متعلق آپ نے مجھے.....''

''بیٹا لڑکی بہت خوبصورت ہے۔''

''ظاہری خوبصورتی سے کیا ہوتا ہے، سیرت اچھی ہونی چاہیے، دل حسین ہونا چاہیے۔''

''بیٹا یہ سب کچھ اس میں ہے۔''

دوسرے دن بیس افراد پر مشتمل قافلہ مع لڑکی انور خان کے گھر وارد ہوا۔ سگائی کی رسم ادا کی گئی۔ نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے ہوئی اور رسم پردہ کے لیے ہونے والے دولہا اور دلہن کے درمیان ایک باریک پردہ کیا گیا جس کے آر پار صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ انور کے سامنے ایک حسین لڑکی تھی جیسے جنت کی حور آسمان سے اتر آئی ہو۔ اس کے پاس کھڑی لڑکی کے منھ سے آواز نکلی۔

''لیڈر''

آواز نہایت دھیمی تھی لیکن انور کے کانوں تک پہنچ گئی۔

تو میری شادی اس لڑکی سے ہو رہی ہے جس نے شاید کچھ اس طرح کا جملہ کہا تھا کہ ''نواب ہوا کے گھوڑے پر....'' لیکن لیڈر کہنے والی لڑکی کی آواز نے اس کے خیال کو منتشر کر دیا۔

''دولہا بھائی کی نگاہیں کیوں جھکی ہوئی ہیں؟ او..ہو.....خاندانی شرافت......''

کچھ دیر کے لیے رشتۂ ازدواج میں بندھنے والے جوڑے کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔

''رقیہ بانو شاید آپ کو شکایت ہو کہ میں صرف بولتا ہوں، نعرہ بازی کرتا ہوں اور عمل کچھ نہیں کرتا۔ اس لے......''

''میں اپنے اس سلوک پر شرمندہ ہوں۔ آپ کی اس تقریر نے بعد میں جو اثر دکھایا، اس کے بعد میرے دل میں تھا کہ کالج میں آپ سے مل کر معافی مانگوں گی۔ لیکن اس سے پہلے ہی یہ اتفاق ہوا کہ جو میرے خوابوں کا شہزادہ بن سکتا تھا اسے قدرت نے میرے شوہر کی شکل میں پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا۔ آپ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں اور میری حقیر محبت کو قبول فرمالیں۔

انور خان کا دل چاہا کہ اس کی اس پیاری ادا پر اس کو گلے لگا لے لیکن دوست و

احباب ان کے نزدیک آ گئے۔ خوشی کے نغمے بجنے لگے۔

انور اور رقیہ کی شادی میں ابھی کچھ دن باقی تھے لیکن کالج میں دونوں کی نزدیکیاں بڑھ گئیں تھیں۔

''رقیہ! آپ میری جان بن گئی ہیں۔ آپ کے ساتھ کے پہلے میری زندگی بنجر اور خشک تھی، آپ نے اسے سیراب کر دیا۔''

''میرے انور! آپ کو پا کر زندگی کی ہر مراد بر آئی۔ اب تو یہی دل کرتا ہے کہ آپ کی آغوش میں سمٹی رہوں۔''

رقیہ کی بات نے انور کو دیوانہ کر دیا۔ اسے خود پر اختیار نہ رہا۔ ایک طرف پیاسی آنکھیں اور پیاسے لب، دوسری طرف متوالی آنکھیں اور شیریں لب۔ لب سے لب جڑ گئے اور دونوں سرور کے عالم میں کھو گئے۔ یکایک رقیہ کو کسی حس نے چونکا دیا۔

''نہیں۔ یہ گناہ ہے۔ ابھی تو رسموں کی دیوار کھڑی ہے۔ جب وقت پر یہ دیوار گر جائے گی۔ ہم ایک ہو جائیں گے۔''

''وقت'' انور کے منہ سے سرد آہ نکلی۔ لیکن بدن کے شعلوں نے گناہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دونوں کو ایک کر دیا۔ وقت کی آندھی ایسی چلی کہ انقلابیوں نے قتل و غارت کو اپنا لیا۔ زندگی درہم برہم ہو گئی۔ اس کا اثر پورے ملک میں پھیل گیا۔ انور کہتا۔

''موت زندگی میں ایک بار آتی ہے اور غلامانہ زندگی کی موت حیات میں ہی کتنی بار ہوتی ہے، اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ انقلاب ہی وہ راستہ ہے جس سے آنے والی نسلیں یہ کہہ سکیں گی کہ ہمارے غازیوں نے اپنا سر دے کر ہمارے لیے آزادی کی اعلیٰ نعمت حاصل کی۔

لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ خونی انقلاب میں شدت ضرور ہوتی ہے لیکن جذباتی حرارت میں مستقل دم نہیں رہتا کیونکہ اس میں اعتدال نہیں ہوتا۔ آخر کب تک لیڈر حکومت کے ہاتھ سے بچتا۔ آخر کار وہ پکڑا گیا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔

رقیہ کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے۔ وہ ملاقات کے لیے جیل گئی۔

''میری محبت۔''

''نہ رو میری جان۔''

''مجھ سے دور جاتے ہوئے آپ مجھے کس کے حوالے کیے جا رہے ہیں۔''

''خدا کے حوالے جو کہ عالم کا رکھوالا ہے۔''

''ملن کا خواب دیکھتے تھے۔''

''میری جان، شاید اب وہ خواب حقیقت نہ بن سکے۔''

''کیوں نہیں.....'' وہ چیخ پڑی لیکن.......مایوس لوٹی۔

فوجی عدالت میں انقلابی لیڈر کو کھڑا کیا گیا لیکن انصاف.......سامراجیوں کی عدالت میں انصاف لفظ کو ناانصافی سمجھا جاتا ہے۔

انور خان نے کہا۔

''انصاف کی اس عدالت میں کھڑے ہو کر انصاف پانے کی امید رکھنے والا بے وقوف ہے۔ معززین جیوری جو کہ سامراجیوں کے پٹھو ہیں، وہ کیا انصاف کریں گے۔ ہر انسان کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق کے حصول کے لیے ہی انقلاب آیا، بغاوت ہوئی۔ میں باغی ہوں اور سامراجی حکومت کے خلاف ہوں۔''

جیوری نے فیصلہ سنایا۔

''انقلاب لا کر خون کی ندیاں بہانے والا، قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والا، قانون کی نگاہوں میں مجرم ہے، قاتل ہے۔ مجرم انور خان ولد احمد خان نے چونکہ اپنے جرم کا اعتراف خود کر لیا ہے لہٰذا ان کو سزائے موت دی جاتی ہے۔''

قوم نے جب یہ فیصلہ سنا تو ہنگامہ برپا کیا لیکن ان کو بھی دبا دیا گیا۔ انور نے تختۂ دار پر کہا۔

''انور کے ایک خون کے قطرے سے دس انور پیدا ہوں گے اور ایک ایک انور سامراجیوں کے لیے چٹان ثابت ہوگا۔ قوموں کی آوازیں دبائی نہیں جا سکتیں۔ وہ طوفان بن کر سامراجیوں کے منصوبوں کو چکنا چور کر دیتی ہیں۔''

انور تو ہمیشہ کے لیے چلا گیا لیکن رقیہ کی زندگی کو الجھن میں ڈال گیا۔ رقیہ کے والد

نے کہا۔

''ذلت کے اس ٹیکے سے بہتر تھا کہ تو مر جاتی۔ انور لوگوں کے دلوں میں مقام بنا گیا کیونکہ لوگ اس کی کالی کرتوت سے بے خبر رہے۔''

حمل کو گرانے کی کوشش رائگاں ہوئی۔ اب آنے والے کو چھپانے کی کوشش میں گھر کے لوگ مصروف ہو گئے۔

(۲)

اس رات ہر طرف اندھیرا تھا۔ بادل گرج رہے تھے، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی۔ دو فرد ایک سودے کے لیے آمنے سامنے تھے۔

ایک بڑا امیر...... ایک بڑا غریب۔ سیٹھ نے کہا۔

"پانچ لاکھ روپے...... تمہاری تقدیر۔"

پانچ لاکھ...... ہاں یہ دولت میری ہے۔ سیٹھ جس بچے کو تم اپنی بیٹی کے ماتھے کا بدنما داغ سمجھ کر میری جھولی میں ڈال رہے ہو، یہی شیر خوار میرے لیے نئے مستقبل کا پیغام لایا ہے۔ دولت سب کچھ ہے۔ دنیا میں دھن کے بغیر آدمی کا سماج میں کوئی مقام نہیں۔

"اب لے جاؤ بچے کو اور سمیٹ لو اس دولت کو۔ دوبارہ اس شہر میں نظر نہ آنا۔"

دونوں جیت گئے۔ سیٹھ نے اپنی کنواری بیٹی کے کنوارے پن کی مہر برقرار رکھی اور غریب نے اپنی جھولی میں دونوں دولتیں سمیٹ لیں۔ سیٹھ اپنی کنواری بیٹی کے لیے کسی راجہ لڑکے کے بارے میں سوچنے لگا تو غریب اس پیسے کے بل بوتے پر نئی زندگی کے منصوبے بنانے لگا۔

وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ میلی کچیلی قمیض میں دولت کا انبار لیے اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تیار ہو جاؤ، ہم شہر چھوڑ کے جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"یہاں سے دور۔"

"مگر کیوں؟ اور یہ بچہ......؟"

''میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں جس کی تکمیل ممکن ہے اور یہ بچہ حرام کا ہے اور آج سے ہمارے ساتھ رہے گا۔ بشیر کہاں گیا؟''

''باہر کھیل رہا ہوگا۔''

''تم تیار ہو جاؤ، میں اس کو لاتا ہوں۔''

سامان سمیٹ لیا گیا۔ قافلہ روانہ ہو گیا۔

کل تک جو سیٹھ کے پاس نوکر تھا، آج اس قصبے کے چھوٹے امیروں میں گنا جاتا تھا۔ جمال نے پانچ لاکھ سے پچاس لاکھ بنائے اور پچاس لاکھ سے کروڑ۔ ان سب کامیابیوں کا باعث وہی بچہ تھا جو سماج کے نام پر داغ تھا۔ جمال اکثر اپنی بیوی رضیہ سے کہتا۔

''یہ بچہ بڑا قسمت والا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' رضیہ کا جواب ہمیشہ الٹا سیدھا ہوتا۔ وہ سوچتی کہ جو حرامی ہے وہ کیسے قسمت والا ہو سکتا ہے۔ وہ اسے برداشت کرنے کو مجبور تھی کیونکہ اس کے شوہر کو لگتا تھا کہ اس بچے کے سبب اس کی قسمت چمکی ہے۔ اس لیے وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ اور اس کے لیے نئے نئے خواب دیکھ رہا تھا۔ بچہ ابھی اسکول جا رہا ہے۔ پھر کالج، پھر یونیورسٹی اور آگے....... اور آگے وہ کہاں تک ترقی کرے گا یہ آنے والا وقت بتائے گا۔

(۳)

جمال اب جمال نہ رہا بلکہ سیٹھ ناصر جمال بن گیا تھا۔ تین بنگلوں اور دو بڑے بڑے کارخانوں کا مالک۔

''بشیر کہاں ہے؟''

''جناب سو رہے ہیں۔''

''اب تک۔''

جمال اپنے بیٹے بشیر کے کمرے میں داخل ہوا۔

''برخوردار۔''

''او......ابا جان.....آپ......'' بشیر نے نیند بھری آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

''تم اب تک سو رہے ہو۔''

''جی......اب تو اٹھ گیا ہوں۔''

''تمہیں یاد ہے آج تمہارا چھوٹا بھائی فوج سے ڈیڑھ سال کے بعد آنے والا ہے۔''

''جی یاد ہے۔''

''جہاز کس وقت آنے والا ہے۔''

''جی.....دس بجے۔''

''اور ابھی کیا بجا ہے۔''

''ساڑھے نو......اوہو۔ بس آدھا گھنٹہ۔ میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ غسل خانے کی اور بھاگا۔ جمال نے اپنی بیوی سے کہا۔

''آج افضل آنے والا ہے۔''

''اونھ.....میں جانتی ہوں آپ سانپ کو دودھ پلا رہے ہیں جو کسی وقت آپ کو ڈس لے گا۔''

جمال کو غصہ آ گیا۔

''رضیہ اپنی اصلیت مت بھولو۔آج ہم جس مقام پر ہیں وہ اسی بچے کی برکت ہے۔''

''یوں کہیے کہ ایک سیٹھ کی بیٹی کے داغ کو چھپانے کے لیے ہم کو پانچ لاکھ روپے رشوت میں ملے۔افضل کی رگوں میں گندہ خون دوڑتا ہے اور وہ ایک دن.......''

''خاموش ہو جاؤ کوئی سنتا ہوگا۔''

''جس کو سننا تھا، اس نے سن لیا۔'' بشیر خود سے بول پڑا۔

''تو وہ میرا بھائی نہیں ہے۔''

اس راز سے واقف ہوتے ہی اس کے دماغ میں نئے خیالات آنے لگے اور اس کی کار ہوائی اڈے کے سامنے رک گئی۔

ہوائی جہاز لینڈ ہو چکا تھا۔افضل نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔دونوں گلے ملے۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے۔''

''ہاں''

''بشیر تمہارا چہرا کیوں اترا ہوا ہے۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھائی آپ نے فوج میں اچھی صحت بنالی۔''

''یار میری اور آپ کی عمر میں فرق ہی کتنا ہے، ہمیں بھائی سے زیادہ دوست ہونا چاہیے۔''

''ہاں دوست'' بشیر سوچنے لگا۔اب تمہیں کون اپنا بھائی سمجھے گا۔نہ جانے یہ کس خاندان کا ہے۔میرا باپ شہر کا مانا ہوا رئیس ہے لیکن کبھی وہ اس عورت کے پاس ملازم تھا جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا۔لیکن حرام کی اولاد......

بنگلے کے سامنے کار رک گئی۔ جمال باہر کھڑا تھا۔افضل دوڑتے ہوئے جمال کے

گلے لگ گیا۔

''افضل، میرے بچے آنکھیں ترس گئی تھیں تجھے دیکھنے کے لیے۔''

رضیہ باہر آئی۔ جمال نے آنکھیں دکھائیں۔

''تمہاری امی۔''

وہ رضیہ سے لپٹ گیا۔

''امی، آپ کچھ ناراض....''

''نہیں بیٹا تم سے کیا ناراضگی، ناراض تو میں تمہارے ابا سے ہوں۔''

''کیوں؟''

''ارے میں نے صبح سے رٹ لگا رکھی ہے کہ بیٹے کو لینے خود جاؤ لیکن ٹس سے مس نہیں ہوئے بس چائے پر چائے پیتے جا رہے ہیں۔ چلو اندر چلیں۔''

اسی دوران باہر ایک کار آکر رکی۔

''ارے رحمت اللہ بھائی'' جمال نے کہا۔ ''سب خیریت تو ہے۔''

''جی ہاں بالکل ٹھیک۔ آپ کے لیے دعوت نامہ ہے مع اہل و عیال۔ میری بیٹی رخسانہ کی سال گرہ میں شرکت فرمائیں۔''

''میرا آنا تو شاید نہ ہو سکے لیکن میرے بیٹے ضرور شرکت کریں گے۔''

''آپ لوگ بھی ہوتے تو...... بہر حال۔''

شام کو بشیر افضل کے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیوں دوست دعوت میں نہیں چلنا۔''

''ابا جان کا حکم میں نہیں ٹال سکتا۔''

''تو پھر جلدی تیار ہو جائیں۔ میں کار نکالتا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہو بشیر۔''

''زندگی کے پہلوؤں پر غور کر رہا ہوں۔ عجیب خیال آ رہا ہے۔''

''جیسے؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ جس آدمی کی رگوں میں گندہ خون دوڑتا ہو، جو ناجائز طریقے سے دنیا میں آیا ہو، وہ سماج کے لیے کیسا ثابت ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کی نیت اچھی ہو، دماغ سلجھا ہوا ہو، وہ سماج کے لیے بہتر فرد ثابت ہوگا۔ چاہے وہ ناجائز طریقے سے ہی دنیا میں کیوں نہ لایا گیا ہو۔''

''وقت ہی اس بات کو ثابت کر سکتا ہے۔''

کار رک گئی۔

''آ گئے آپ لوگ۔''

''جی۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔''

''میری بیٹی رخسانہ سے ملیے۔ بیٹی ان سے ملو جمال ناصر کے بڑے بیٹے بشیر ناصر اور چھوٹے بیٹے کیپٹن افضل ہیں۔''

''آداب۔'' رخسانہ حسن کا انگارہ تھی۔ نہایت خوبصورت، سڈول جسم کے انگ انگ سے جوانی رس ٹپکا رہی تھی۔ کیپٹن افضل اس حسین شاہکار کے خواب میں ڈوب گیا جہاں رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک نئی منزل کی اور جا رہا تھا۔

لیکن رخسانہ نے اپنی منزل بشیر کی آنکھوں میں پائی اور بشیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت مدت ہوئی جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''تصور میں تو آپ ہمارے ہر وقت رہتے ہیں۔''

اور پھر سالگرہ میں کچھ ایسے اشارے اور وعدے ارادے ہوئے کہ افضل سمجھ گیا کہ بشیر بھی رخسانہ کی جانب مائل ہے لیکن وہ رخسانہ کی نظروں کو نہ پڑھ سکا۔

''شاید رخسانہ بھی بشیر سے محبت کرتی ہو، لیکن اس کا رجحان تو میری طرف بھی ہے کیوں نہ رخسانہ سے بات کر کے دیکھوں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''

''وہ تمہارا چھوٹا بھائی افضل مجھ سے محبت کرتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ گھنٹوں وہ میری تصویر میں کھویا رہتا ہے۔''

''اس کی یہ مجال۔''

''مجال.....وہ تمہارا بھائی ہے لیکن شاید اس کو معلوم نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔''

''نہیں اسے معلوم ہوگا۔ خون کی گندگی آخر کب تک چھپی رہتی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے، کسی کی ناجائز اولاد ہے جسے میرے باپ رحم کھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔''

رخسانہ نے اس کے لب پر اپنے لب رکھ دیے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس کے پہلو میں سمٹ گئی۔

حقیقت کب تک چھپتی ہے۔ بشیر نے غصے میں آکر اپنی اور رخسانہ کی محبت کی کہانی اور اس میں افضل کی دخل اندازی کی کہانی اپنی ماں رضیہ کو سنائی۔ رضیہ نے بھی گندے خون کو برا بھلا کہا اور اپنے بیٹے بشیر اور رخسانہ کی شادی کا وعدہ کیا۔ افضل کو جب اپنے ناجائز ہونے کا علم ہوا تو جذباتی طور پر اس کے دل میں آیا کہ خودکشی کر لے لیکن تھا وہ فوجی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ساری حقیقت جانے بنا خودکشی بزدلی ہے اور وہ ناجائز تو ہو سکتا ہے لیکن بزدل کبھی نہیں۔

جمال کے دل میں خیال آیا کہ اس نے سب کے لیے کچھ نہ کچھ کیا لیکن اپنے محسن افضل جس کی بدولت آج وہ شہر کے رئیسوں میں گنا جاتا تھا، کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

''رضیہ میں چاہتا ہوں کہ رخسانہ اور افضل کی شادی کر دی جائے، تمہارا کیا خیال ہے۔''

''آخر اس گندے خون نے اپنا اثر دکھا ہی دیا۔ بشیر اور رخسانہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی اس نے رخسانہ کو ایسی نظر سے دیکھا۔ اور اب یہ جان کر بھی کہ وہ ناجائز ہے، اس نے آپ کو ورغلایا ہے۔''

''نہیں نہیں.....اس نے مجھے کچھ نہیں کہا.....تو کیا اسے معلوم ہو گیا.....اف خدایا۔ اگر بشیر اور رخسانہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں افضل کے لیے دوسرا رشتہ ڈھونڈ لوں گا۔''

جمال سیٹھ رحمت اللہ کے پاس رخسانہ اور بشیر کا رشتہ پکا کرنے گیا۔

''اب تو رخسانہ بیٹی ہماری ہوگئی تو کیوں نہ اس کے ساتھ ہی ایک اور رشتہ جوڑ لیا جائے۔''

''جی.....؟''

''آپ کے بھائی نوراللہ کی بیٹی کا رشتہ افضل سے کیوں نہ ہو جائے۔''

''جمال صاحب آپ رشتے میں میرے سمدھی ہونے والے ہیں اور ایسے بچے کے لیے رشتہ جوڑ رہے ہیں جس کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں۔ کہاں میرا اعلیٰ خاندان اور کہاں.....؟''

'اعلیٰ خاندان وہ نہیں ہوتا جس کے پاس دولت ہو۔ خاندان وہ اعلیٰ ہوتا ہے جہاں انسان بستے ہیں۔ انسانیت بستی ہے۔''

''آپ میرے خاندان کی توہین کر رہے ہیں۔ آپ کی زبان بے لگام ہوتی جا رہی ہے۔''

''آپ دولت کے نشے میں عزت و احترام بھولے جا رہے ہیں۔ میں ایسی جگہ رشتہ نہیں جوڑ سکتا۔'' جمال اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمت اللہ دیکھتے رہے۔

رضیہ کو جب یہ پتہ چلا تو اس نے طوفان کھڑا کر دیا۔

''وہ حرامی اب ہماری خوشیوں میں رخنہ ڈالے گا۔ یا تو وہ اب اس گھر میں رہے گا یا میں۔ اور آپ فوراً جایئے اور ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے جوڑ کر آیئے ورنہ میں اور بشیر کچھ کر بیٹھیں گے۔''

جمال سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کریں۔ ادھر رحمت اللہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ جوش میں زیادہ آگے بڑھ گئے تھے۔ بشیر جیسا اچھا رشتہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ وہ اپنی غلطی سمجھ گئے اور جمال کے کچھ کرنے سے پہلے ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔''

رشتہ برقرار رہا۔ رضیہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ بشیر رخسانہ کے ساتھ رنگ رلیوں میں کھو گیا۔ جمال نے افضل کے رشتے کے لیے ہر اچھے در پر دستک دی لیکن ناجائز ہونے کے

داغ نے افضل کا رشتہ کہیں بھی جمنے نہ دیا۔ جمال جب بھی افضل کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتا، پاگل سا ہو جاتا لیکن کچھ کہہ نہ پاتا۔ افضل بھی اپنے محسن کو نظر بھر دیکھتا اور چپ رہتا۔ جمال سوچ رہا تھا کہ اگر افضل کی شادی ہو جائے گی تو اس کی ویران زندگی میں بہار آ جائے گی۔ لیکن افضل سے شادی کرے گا کون.....اوہ..... ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

ولی شاہ نے جب جمال کو دیکھا تو ادب سے کھڑا ہو گیا۔

''ارے جمال سیٹھ۔ آیئے۔''

''یہاں سے گذر رہا تھا کہ سوچا تم سے ملتا چلوں۔ کیسی طبیعت ہے۔''

''سیٹھ آپ تو جانتے ہیں کہ کاروبار اچھا نہیں چل رہا۔ آپ کے روپئے لوٹانے کی مجھے بہت فکر ہے لیکن اب تک کچھ بن نہیں پڑا.....میں جلد ہی.....''

''ارے ولی میں اس لیے نہیں آیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے بیٹے افضل کی شادی تمہاری بیٹی.....''

''جناب رک جایئے....افضل آپ کا بیٹا کب سے ہو گیا۔ سارا شہر اس کی اصلیت جانتا ہے۔''

''لیکن ولی۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ میں سوچتا تھا کہ تم میری بات سمجھو گے۔''

''ہاں.....میں آپ کی دھمکی کو خوب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھئے.....بھلے آپ میری حویلی نیلام کروا دیں۔''

''ولی شاہ میرا کوئی ایسا ارادہ تو نہیں تھا۔ لیکن تمہارے دل کی نفرت نے تمہارے خیالات کو اجاگر کر دیا۔ اب تو یہی ہوگا۔ اگر تمہاری بیٹی سے افضل کی شادی نہ ہوئی تو یقیناً تمہاری حویلی کے ساتھ ساتھ تمہاری جھوٹی شان و شوکت اور عزت نیلام ہو کر رہے گی۔''

اسی درمیان ولی شاہ کی بیٹی فریدہ بھی آ گئی۔ قدرت کا حسین شاہکار۔

''کیا بات ہے ڈیڈی.....چاچا جی آپ کھڑے کیوں ہیں۔ بیٹھئے۔''

جمال نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹی میں نے ولی سے جو کچھ کہا ہے، تم بھی اس پر غور کرنا اور اگر سمجھ سکو تو اپنے ڈیڈی کو بھی سمجھانا کہ سب کی بھلائی کس میں ہے۔''

فریدہ نے باپ سے سب کچھ سننے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میری زندگی برباد ہو تو ہو لیکن میں باپ دادا کی پگڑی پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گی۔ شادی طے ہوگئی۔ ولی رنجیدہ تھا کہ اس کی آبرو کے لیے بیٹی اپنی زندگی قربان کر رہی ہے۔

افضل عجب پس و پیش میں تھا کہ کیا کرے۔ تھک ہار کر اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ بھاری من سے افضل سہاگ رات کے کمرے میں داخل ہوا اور ڈرتے ڈرتے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ جوانی کے دہکتے ہوئے انگارے نے اس کی آنکھوں کو ایک مرتبہ خیرہ کر دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ۔

''میں جانتی ہوں کہ تم ایک ناجائز اولاد ہو اور میں نے اپنے خاندان کی آبرو اور وقار برقرار رکھنے کے لیے تم سے مجبوری میں شادی کی۔ تم زبردستی میرا جسم حاصل کر سکتے ہو۔ تم نے روپیوں کے بل پر مجھے حاصل کیا لیکن میرا پیار بکاؤ نہیں۔ مجھے تم سے نفرت ہے صرف نفرت۔''

افضل کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں نفرت...... اس کے علاوہ اب میں دنیا سے توقع ہی کیا کر سکتا ہوں۔ تم آرام سے سو جاؤ۔'' اس جملے سے فریدہ کے دل میں کچھ پلوں کے لیے پیار کا جذبہ پھوٹا لیکن فوراً انتقام کی آگ نے اسے جلا کر راکھ کر دیا۔

جمال خوش تھا کہ افضل کی شادی ہوگئی۔ اب کچھ دن میں پوتا بھی آجائے گا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ افضل کو واپس جانا پڑا۔ فریدہ تنہائی کی ویرانی کو گلے لگاتی رہی۔

''کیا بات ہے یار۔ جب سے واپس آئے ہو بدلے بدلے ہی رہے۔ یہاں تک کہ تمہارے واپس گھر جانے کا وقت بھی آ گیا۔ شادی کے بعد سب خیریت تو ہے۔''

''ہاں زندگی میں تو سب کچھ ہے دوست۔ خیریت سکھ دکھ۔ کل مجھے یہاں سے گھر جانا ہے لیکن دل نہیں چاہتا۔ پھر سوچتا ہوں دن ہی تو کاٹنے ہیں۔ چاہے یہاں، چاہے وہاں۔''

وہ ریل گاڑی میں سوار ہوا۔ زندگی سے بے پرواہ۔ بے مقصد۔ یکا یک ریل رک گئی۔ باہر بڑا شور تھا۔

''کیا ہوا....''

''انقلابیوں نے ریل کو روک دیا ہے اور اس ڈبے کو لوٹ لیا جس میں خزانہ تھا۔''

افضل سوچنے لگا۔

انقلابیوں کی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے۔ ایک منزل۔ قوم کی آزادی۔ اور میری زندگی.......

''آ گئے بیٹا۔''

''جی''

''اب کہ تو لمبی چھٹی پر آئے ہو گے۔''

''جی........فریدہ......''

''بیٹا وہ میکے چلی گئی۔ اب تمہیں اسے لینے جانا ہوگا۔''

''ضروری ہے۔''

''ہاں۔ کل جا کر اپنی بیوی کو لے آنا۔''

نوکر دوڑتا ہوا فریدہ کے پاس آیا۔

''بی بی۔ میں نے افضل بابو کو دیکھا۔''

''اچھا......ڈیڈی۔''

''نہیں بیٹی میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گا.....وہ حرامی ہے۔''

افضل نے آخری جملہ سن لیا اور وہیں سے واپس چلا آیا۔ زندگی کا بوجھ اب برداشت سے باہر تھا۔ اس نے فریدہ کے نام ایک خط لکھا جس کے ساتھ اور لوگوں کے نام بھی خطوط تھے۔

فریدہ۔

مری رگوں میں گندہ خون دوڑ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے باپ کہلانے

والے میرے محسن جمال صاحب نے تمہارے والد کے آگے کیا شرط رکھی اور تم سے میری شادی کن حالات میں ہوئی۔ یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ میں تمہیں کچھ نہ دے سکا۔ اپنا نام تمہارے نام کے ساتھ جوڑنے کا عظیم گناہ مجھ سے ہو گیا۔ جس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں تمہاری زندگی سے بہت دور جا رہا ہوں۔ تمہارے خط کے ساتھ چار خط اور ہیں ہو سکے تو انہیں میرے گھر والوں کے پاس پہنچا دینا۔"

فریدہ نے تینوں خط سامنے رکھ دیے۔

امی

آپ نے جو کچھ کہا وہ حقیقت تھی اور حق کہنا گناہ نہیں ہوتا۔ مجھے اس بات کا افسوس ضرور رہے گا کہ آپ کے لیے میں ہمیشہ بدنامی کا باعث بنا رہا اور آپ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

افضل

ابا جان

آپ کا اور میرا رشتہ وہ نہیں لیکن جو محبت آپ نے مجھے دی اس کے بدلے میں آپ کو بدنامی اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہ دے سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

افضل

بشیر صاحب

میں آپ کی راہ کا کانٹا تھا۔ تم نے میرے بارے میں سچ کہا تھا۔ حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ناراضگی کیسی۔

افضل

رخسانہ

میں نے تم سے محبت کی تھی لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ تم بشیر سے محبت کرتی ہو، میں نے تمہارا خیال اپنے دل سے نکال دیا تھا۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔

افضل

جمال صدمے سے بے ہوش ہو گئے۔ باقی تینوں بت بن کر ایک دوسرے کا منہ

حیرت سے تکنے لگے۔

(۴)

افضل متواتر تین دن تک پیدل چلتا رہا۔ بنا کھائے پیئے۔ بدن نحیف ہو گیا تھا۔ آخر کار بدن چلنے کی تاب نہ لا سکا اور وہ ایک جھونپڑی کے سامنے گر گیا۔ آواز سن کر جھونپڑی کے اندر سے ایک آدمی نکلا۔

''یہ کون ہے۔''

''ناصر تم کہاں تھے۔''

''پیر صاحب باہر ایک آدمی بے ہوش پڑا ملا۔ میں اس کو اندر لے آیا ہوں۔''

''بہت اچھا کیا۔ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے پاس لانا۔ مجھے اس سے باتیں کرنی ہیں۔ اور اس کا اچھی طرح خیال رکھو۔''

پیر صاحب نے من ہی من کہا ''شاید وہی ہو۔''

''میں کہاں ہوں؟''

''آپ محفوظ ہیں اور شاہ کمال کے سائے میں آ گئے ہیں۔''

''شاہ کمال صاحب۔ نام سنا ہے۔ کہتے ہیں خدا دوست آدمی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''وہ خود آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر چلئے۔''

''السلام علیکم پیر صاحب۔ میں افضل ہوں۔''

''افضل کمال کہو۔''

''میں سمجھا نہیں، میں گنہگار......''

''تم میرے بعد اس گدی کے وارث ہو۔''

''لیکن میں اس قابل......''

''قابل، قابلیت کا سوال ہی کہاں ہے۔ یہ تو دل کا سوال ہے۔ جس کا دل صاف ہو۔ جس کے دل میں کسی کے لیے نفرت نہ ہو وہ خدا کے قریب ہوتا ہے۔ اپنی زندگی یوں ضائع مت کرو، میری خواہش پوری کرو۔''

''لیکن......''

''مجھے یقین ہے کہ تم میرے بعد میری گدی اچھی طرح سنبھال سکتے ہو۔''

یہ الفاظ پیر صاحب نے کچھ اس انداز میں کہے کہ افضل کے منہ سے سوائے ان لفظوں کے اور کچھ نہ نکل سکا ''آپ کا حکم اور یقین سر آنکھوں پر۔''

وقت گزرتا گیا۔ پیر صاحب دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور افضل کی گفتگو اور نیک کاموں کے سبب لوگ اسے پیر صاحب کہنے لگے۔

ایک دن ناصر نے کہا۔

''پیر صاحب۔ وہ جو انقلابی جماعت ہے نہ جو ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، اسے سامراجی حکومت نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ پیدائشی حق کے لیے اتنے لوگوں نے اپنے خون کی قربانی دی ہے۔ کتنی امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف دعاؤں کے لیے ہاتھ ہیں۔''

''ہاں''

اسی وقت رحیموں بھاگتا ہوا آیا۔

''انقلابی تحریک کی آخری کمپنی کو بھی ختم کر دیا گیا۔''

''اب کیا ہوگا۔ کیا قوم غلام ہی رہے گی۔ مجھے بڑی بے چینی ہو رہی ہے کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں بالکل تنہا رہوں اور کچھ سکون ملے۔''

''پیر صاحب ایسی جگہ ہے۔ سامنے کی چھوٹی پہاڑی پر ایک بڑا درخت ہے۔ بڑے پیر صاحب بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر سکون حاصل کرتے تھے۔''

''وہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔''

''آدھا گھنٹہ۔''

''چلو''

افضل درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ دل کو کچھ سکون ہوا۔ آنکھ لگ گئی۔ خواب میں آزاد ملک دیکھا۔ پھر ایک چندن کا تخت، اس پر ایک نور کا سایہ جلوہ گر ہوا۔

''پیر صاحب آپ''

''ہاں بیٹا۔''

''آپ نے جتنی ذمہ داری مجھے دی اس نے مجھے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ میرے بہت سے فرض اس میں دم توڑ رہے ہیں۔ آزادی کے لیے جدوجہد کرنا میرے اوپر بھی فرض ہے۔ لہو پکار رہا ہے لیکن سماجی اور خلاقی ذمہ داری نے میرے پیر باندھ دیے ہیں۔ حالانکہ میں بھی پہلے فوج میں تھا لیکن اب روح کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔''

''میرے بیٹے۔ آزادی کی جدوجہد بھی تو اخلاقی اور سماجی فرائض میں شامل ہے۔ تم بالکل آزاد ہو۔ تم میں وہ صلاحیت ہے کہ تم سماجی اور اخلاقی کاموں کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی میں بھی شریک ہو سکتے ہو۔''

''افضل کی آنکھ کھل گئی۔''

''ناصر! پیر صاحب نے مجھے خواب میں بشارت دی اور کہا کہ میں انقلابی تحریک میں شامل ہو سکتا ہوں۔''

''لیکن تنظیم تو ختم ہو گئی۔''

''تو کیا ہوا۔ نئی تنظیم بنائی جائے گی۔ تم آج گاؤں والوں کو اکٹھا کرو۔ میں ان سے گفتگو کروں گا۔''

''پیر صاحب یہ آپ نے میرے دل کی بات کہیں۔ میں ابھی کام میں لگ جاتا ہوں۔''

لوگ جمع ہوئے۔ افضل نے آزادی کے متعلق تقریر کی۔ وہ چھوٹی سی بستی متاثر ہوئی

اور تیس آدمیوں کی جماعت انقلابی تحریک میں شامل ہوئی۔ طے یہ ہوا کہ ۵ رکیلو میٹر دور پل کے پاس جو حکومت کی پوسٹ ہے، اس پر حملہ کر کے انقلاب کا آغاز کیا جائے۔

رات کا سناٹا تھا۔ افضل اور رحمٰن پل کو پار کرنے لگے۔ دو سپاہی جو اس وقت وہاں موجود تھے، ایک ساتھ بول پڑے۔

''اسٹاپ۔ کون ہو تم؟ کہاں جا رہے ہو؟''

''مائی باپ، ہم گاؤں کے آدمی ہیں۔ بیٹا بیمار ہے۔ وید کو لینے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن تمہاری تلاشی لینی ہوگی۔ ہاتھ اوپر کرو۔''

''جی مائی باپ۔''

جیسے ہی دونوں سپاہی تلاشی لینے کو نیچے جھکے، افضل نے فوجی داؤں دکھاتے ہوئے اس سپاہی کو قابو میں کر لیا۔ رحمٰن نے بھی اپنی طاقت کام میں لائی۔ بندوقیں چھین لی گئیں اور سپاہیوں کو دریا میں پھینک دیا گیا۔

''پہلی کامیابی مبارک۔''

''شکریہ۔ کیا آپ لوگوں میں کوئی بندوق چلانا جانتا ہے۔''

''جی ہاں، میں جانتا ہوں۔'' صابر نے کہا۔

''ٹھیک ہے کل سے آپ بندوق چلانا سکھائیں گے۔ لیکن اس کے لیے کوئی محفوظ مقام ضروری ہے۔''

''پاس کے گھنے جنگل میں ایک مقام ہے جناب اور وہاں ایک بڑا غار بھی ہے جہاں رہا بھی جا سکتا ہے۔''

''تو پھر آج سے اپنا مسکن وہی ہوگا۔''

دوسرے دن اخبار کی سب سے بڑی سرخی یہی تھی کہ ایک نئی انقلابی تحریک نے جنم لیا اور پل کے پاس کے پوسٹ کو تباہ کر دیا۔ آزادی کے خواہش منداس خبر کو پڑھ کر جھوم اٹھے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرنے لگے۔

افضل نے متاثر کن تقریر کے بعد اپنا نقطۂ نظر رکھا۔

''دوستو! اب ہمیں کوئی بڑا کام کرنا چاہیے جس سے حکومت ہل جائے۔ مثلاً کسی بڑی چھاؤنی پر حملہ کرنا چاہیے۔''

''پیر صاحب۔ یہاں سے چار میل کی دوری پر ایک آبشار ہے۔ اسی کے پاس فوج کی ایک چھاؤنی ہے لیکن اس کو جیتنے کے لیے کم از کم ۳۰ بموں کی ضرورت ہوگی۔''

''اس کا انتظام ہے۔''

''تو پھر چلو۔''

یکا یک متواتر بموں کے دھماکوں سے چھاؤنی میں انتشار پھیل گیا۔ سپاہی سمجھ نہیں پائے کہ کیا ہوا۔ خبر یہ پھیلی کہ شاید بارود گودام میں آگ لگ گئی ہے اور اس لیے متواتر دھماکے ہو رہے ہیں۔ ادھر انقلابی جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ چھاؤنی پر قابو پا لیا گیا۔ سپاہیوں کے ہاتھ پاؤں باندھے جانے لگے۔

''ارے! کیپٹن افضل آپ یہاں کیسے؟ یاد ہے ہم دونوں برما کے محاذ پر ساتھ لڑے تھے۔''

''بے وقوف'' صابر نے کہا ''یہ نئی تحریک کے سربراہ ہیں، جو آزادی حاصل کر کے ہی دم لے گی۔''

''تو جناب لیڈر بن گئے ہیں۔ لیکن حکومت کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کسی دن پکڑے گئے تو مارے جاؤ گے۔''

''بے وقوف ہم مرنے کے لیے ہی تو نکلے ہیں۔''

انقلابیوں نے وہاں کا سب کچھ لوٹ لیا۔ راشن پانی، گولہ بارود بندوقیں۔ لڑائی کے دوران چھ سپاہی جاں بہ حق ہوئے اور کئی شدید زخمی۔ اس حملے نے حکومت کی نیند اڑا دی۔ کیپٹن افضل اپنی ساری فوجی صلاحیت کا استعمال انہیں کے خلاف کر رہا تھا۔ انقلابیوں اور ان کے چاہنے والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

(۵)

ولی شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی کی آواز سے چونک پڑے۔

''چاچا جی۔''

''ارے۔ بیٹی نوشابہ۔''

''جی''

''خیریت سے ہو۔ تمہیں آنے کا خط کب لکھا تھا اور تم اب آ رہی ہو۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اصل میں میرا امتحان تھا۔ اسے مکمل کر کے فوراً آ گئی۔ فریدہ کیسی ہے؟''

''جاؤ خود ہی مل لو۔ میں تمہارا سامان رکھواتا ہوں اور ناشتہ بھجواتا ہوں۔''

نوشابہ ولی شاہ کے سالے کی بیٹی تھی۔ فریدہ کی سہیلی۔ افضل کے جانے کے بعد اور اس کا خط پڑھ کر فریدہ کے دل و دماغ پر عجب اثر ہوا تھا۔ وہ افضل سے کیے ہوئے اپنے رویوں سے خود کو گنہگار سمجھنے لگی تھی۔ نوشابہ نے فریدہ کی آنکھوں پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا۔

''بتاؤ۔ ہم کون؟''

''نوشابہ''

''کمال ہے میں اتنے دن تم سے دور رہی پھر بھی تم نے میری آواز پہچان لی۔''

''تم نظروں سے دور رہی، دل سے نہیں۔''

''کیا بات ہے، اداس لگتی ہو۔''

''نہیں تو۔''

''اچھا میں تمہیں ایک Joke سناتی ہوں۔''

''تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ اور کوئی خبر سناؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک دھماکے دار خبر سناتی ہوں۔ فوج سے بھاگا ہوا کیپٹن افضل انقلابی تحریک کا سربراہ۔''

''کیا؟''

''جی ہاں۔ آج کے اخبار کی سرخی یہی ہے۔ خبر کے ساتھ افضل کا فوٹو بھی چھپا ہے۔ یہ دیکھو۔'' فریدہ افضل کی تصویر کو چومنے لگی۔

''کیا پاگل پن ہے۔ تم تو اس سے شدید نفرت......''

''وہ میری شدید بھول اور شدید گناہ تھا۔''

ولی شاہ نے بھی اخبار کی سرخی کا مطالعہ کرلیا تھا اور بے چینی سے ہال میں ٹہل رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

''ولی شاہ۔''

''جناب''

میں حکومت کا افسر بول رہا ہوں۔ آپ ابھی پولیس اسٹیشن آ جایئے۔ میں یہیں بیٹھا آپ کا انتظار کررہا ہوں۔''

''جی بہت اچھا۔''

تھوڑی دیر میں ولی شاہ کی کار پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔

''آیئے ولی شاہ صاحب۔ آپ کو یہاں یہ بتانے کے لیے زحمت دی گئی ہے کہ وہ جو کالج بنانے کا ٹھیکہ آپ کو دیا گیا تھا۔''

''جی ہاں۔''

''وہ آپ سے چھین لیا گیا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نے جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید کیا ہے۔''

''جی میں سمجھا نہیں۔''

''آپ کے داماد کیپٹن افضل انقلابی تحریک کے سربراہ ہیں۔''

''لیکن اس کا میرے ساتھ کیا واسطہ ہے؟''

''آپ کے ساتھ واسطہ ہو نہ ہو لیکن حکومت کو لگتا ہے کہ آپ انقلابیوں کا پتہ ٹھکانا جانتے ہیں۔ جا کر کسی انقلابی کو پکڑ لایئے یا ان کا پتہ ہمیں بتا دیجیے۔ ایک کیا آپ کو تین چار ٹھیکے دلوا دوں گا۔'' ولی شاہ کے دل میں انقلابیوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

مایوسی کی حالت میں ولی شاہ گھر واپس آیا اور جمال کو فون کر کے سارے حالات بتائے۔

''فکر نہ کرو۔ میرا ایک پرانا دوست آج کل حکومت میں بہت رسوخ رکھتا ہے۔ اس کو میں نے اپنے گھر بلایا بھی ہے۔ اس کی مدد سے حکومت کو یقین ہو جائے گا کہ آپ کا کسی قسم کا بھی تعلق انقلابی تنظیم سے نہیں ہے۔''

جمال بے صبری سے آنے والے مہمانوں کا ریلوے اسٹیشن پر منتظر تھا۔ گاڑی آ گئی۔

''آ.... اجمل..... سفر تو اچھا رہا۔''

''ہاں یار۔ ان سے ملو، میری بیوی رقیہ۔''

''رقیہ'' جمال چونک پڑا۔ رقیہ نے بھی جمال کو پہچان لیا۔

''چلیے گھر چلیں۔''

رات کے دس بج رہے تھے۔ جمال کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ اب تک باغیچے میں اکیلے بیٹھے کش پہ کش لگا رہے تھے۔

''رقیہ ہی افضل کی ماں ہے اور مرحوم انور خاں اس کا ناجائز باپ۔ لیکن خون تو خون ہے۔ انور خان بھی انقلابی اور افضل بھی۔''

یکا یک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

''کون؟ ارے رقیہ آپ.... اس وقت....''

''مجھے میرا بیٹا لوٹا دو۔''

''اچھا میں تمہیں ایک Joke سناتی ہوں۔''

''تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ اور کوئی خبر سناؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک دھماکے دار خبر سناتی ہوں۔ فوج سے بھاگا ہوا کیپٹن افضل انقلابی تحریک کا سربراہ۔''

''کیا؟''

''جی ہاں۔ آج کے اخبار کی سرخی یہی ہے۔ خبر کے ساتھ افضل کا فوٹو بھی چھپا ہے۔ یہ دیکھو۔'' فریدہ افضل کی تصویر کو چومنے لگی۔

''کیا پاگل پن ہے۔ تم تو اس سے شدید نفرت......''

''وہ میری شدید بھول اور شدید گناہ تھا۔''

ولی شاہ نے بھی اخبار کی سرخی کا مطالعہ کر لیا تھا اور بے چینی سے ہال میں ٹہل رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

''ولی شاہ۔''

''جناب''

میں حکومت کا افسر بول رہا ہوں۔ آپ ابھی پولیس اسٹیشن آ جائیے۔ میں یہیں بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''جی بہت اچھا۔''

تھوڑی دیر میں ولی شاہ کی کار پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔

''آیئے ولی شاہ صاحب۔ آپ کو یہاں یہ بتانے کے لیے زحمت دی گئی ہے کہ وہ جو کالج بنانے کا ٹھیکہ آپ کو دیا گیا تھا۔''

''جی ہاں۔''

''وہ آپ سے چھین لیا گیا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نے جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید کیا ہے۔''

"جی میں سمجھا نہیں۔"

"آپ کے داماد کیپٹن افضل انقلابی تحریک کے سربراہ ہیں۔"

"لیکن اس کا میرے ساتھ کیا واسطہ ہے؟"

"آپ کے ساتھ واسطہ ہو نہ ہو لیکن حکومت کو لگتا ہے کہ آپ انقلابیوں کا پتہ ٹھکانا جانتے ہیں۔ جا کر کسی انقلابی کو پکڑ لایئے یا ان کا پتہ ہمیں بتا دیجیے۔ ایک کیا آپ کو تین چار ٹھیکے دلوا دوں گا۔" ولی شاہ کے دل میں انقلابیوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

مایوسی کی حالت میں ولی شاہ گھر واپس آیا اور جمال کو فون کر کے سارے حالات بتائے۔

"فکر نہ کرو۔ میرا ایک پرانا دوست آج کل حکومت میں بہت رسوخ رکھتا ہے۔ اس کو میں نے اپنے گھر بلایا بھی ہے۔ اس کی مدد سے حکومت کو یقین ہو جائے گا کہ آپ کا کسی قسم کا بھی تعلق انقلابی تنظیم سے نہیں ہے۔"

جمال بے صبری سے آنے والے مہمانوں کا ریلوے اسٹیشن پر منتظر تھا۔ گاڑی آ گئی۔

"آ.... اجمل..... سفر تو اچھا رہا۔"

"ہاں یار۔ ان سے ملو، میری بیوی رقیہ۔"

"رقیہ" جمال چونک پڑا۔ رقیہ نے بھی جمال کو پہچان لیا۔

"چلیے گھر چلیں۔"

رات کے دس بج رہے تھے۔ جمال کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ اب تک باغیچے میں اکیلے بیٹھے کش پہ کش لگا رہے تھے۔

"رقیہ ہی افضل کی ماں ہے اور مرحوم انور خاں اس کا ناجائز باپ۔ لیکن خون تو خون ہے۔ انور خان بھی انقلابی اور افضل بھی۔"

یکا یک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"کون؟ ارے رقیہ آپ.... اس وقت...."

"مجھے میرا بیٹا لوٹا دو۔"

''تمہارا بیٹا۔ اچھا تمہارا ناجائز بیٹا۔ کیا تمہارا شوہر اسے اپنانے کو راضی ہوگا۔''

''وہ کیوں نہ ہوگا۔ اسے سب معلوم تھا۔ پچاس لاکھ روپے نقد اور دو فیکٹری کے عوض اس نے مجھ سے شادی کی۔ لیکن اولاد سے محروم رہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں کبھی اولاد نہ ہوگی۔''

''اچھا تو تم مجبوری میں اپنے ناجائز بیٹے کو اپنا رہی ہو تاکہ تمہارے گھر میں چراغ جلانے والا کوئی ہو۔ اگر بیٹے کی ممتا جگی نہ ہوتی تو تمہیں اس کا خیال تک نہ آتا۔ تم اس کی ماں نہیں ہوسکتی۔ وہ بن ماں کا بچہ ہے۔ اس کا صرف باپ ہے اور وہ میں ہوں۔''

''میرے حال پر رحم کھاؤ۔ تمہیں ایک ماں کے آنسوؤں کا واسطہ۔ مجھے میرا بیٹا لوٹا دو۔''

''تمہارا..... نہیں میرا بیٹا، قوم کا سربراہ بن گیا ہے۔ قوم اس کے نام پر مر مٹنے کو تیار ہے۔ بالکل اپنے جنم دینے والے باپ انور خاں پر گیا ہے۔ تم نے کیپٹن افضل کا نام تو سنا ہوگا۔''

''کیپٹن افضل ..... میرا بیٹا.....''

''اجمل ہمارا بیٹا مل گیا۔''

''کیا؟''

''ہاں کیپٹن افضل ہمارا بیٹا ہے۔ اب ہمیں یہ بات دنیا کو بتانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے باپ کے بارے میں کیا بتائیں گے۔''

''اخبار میں چھپوا دو کہ افضل کے نانا ہماری شادی کو راضی نہیں تھے۔ تو ہم نے چپکے سے نکاح کر لیا اور اس کے بعد افضل پیدا ہوا تو اسے جمال کے حوالے کر دیا کہ جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو بچہ واپس لے لیں گے۔ اسی درمیان جمال شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ بعد میں افضل کے نانا راضی ہو گئے اور دنیا کے سامنے ہماری شادی ہوئی لیکن ہمیں دوسرے ملک جانا پڑا۔ کئی سالوں کے بعد واپسی پر ہم نے جمال سے ملاقات کی تو پتہ چلا کہ کیپٹن افضل ہی ہمارا بیٹا ہے۔''

دوسرے دن اخبار والے چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔

''کیپٹن افضل کے ماں باپ مل گئے۔ایک حیرت انگیز انکشاف۔''

رضیہ بشیر اور رخسانہ نے جب یہ خبر سنی تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

نوشابہ نے فریدہ سے چیختے ہوئے کہا۔

''آج ایٹم بم پھٹ گیا۔''

''کیا بک رہی ہو۔''

''کیپٹن افضل کے ماں باپ مل گئے۔''

''میرا شوہر ناجائز نہیں ہے۔وہ دن جلدی آئے کہ میں اسکے پیروں پر اپنا سر رکھ کر معافی مانگ سکوں۔''

(۶)

آزادی کی وہ تحریک جو مکمل مردہ ہونے کے بعد از سر نو افضل کے ہاتھوں تشکیل پائی تھی، نے اب طوفان کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ اس میں شامل ہو رہے تھے۔ روز کہیں نہ کہیں کوئی سرکاری دفتر تباہ ہوتا، فوجی ہلاک ہوتے۔ سامراجی حکومت دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

افضل نے انقلابیوں کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کی۔

''آزادی کے متوالوں۔ وہ دن دور نہیں کہ جب ہم آزاد فضا میں سانس لیں گے۔ یہ جنگ کے آخری مراحل ہیں۔ اب ہمیں وہ کرنا ہے جو سامراجی حکومت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو۔ اب ہم سکریٹریٹ اور جیل پر حملہ کریں گے۔ سکریٹریٹ جہاں خاکستر کیا جائے گا وہیں جیل پر حملہ کر کے ہمارے جو بے گناہ قومی بھائی انقلابی ہونے کے شک میں سزا کاٹ رہے ہیں، ان کو آزاد کرایا جائے گا۔

پہلا کام ناصر اپنی ٹکڑی کے ساتھ کرے گا اور دوسرے میں میں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔ آپ لوگوں کے لیے بھی الگ الگ کام طے کر دیے گئے ہیں۔ آپ لوگ ان کو انجام دیں گے۔''

''انقلاب.....زندہ باد''

دوسرے دن اخبار میں انقلابیوں کا ایک اور کارنامہ چھپا تھا۔

''کیپٹن افضل کی شہر میں آمد، انقلابیوں نے اس کی سربراہی میں حکومت کا پولیس ہیڈ کوارٹر قبضے میں لے لیا۔''

فریدہ نے خبر پڑھ کر ایک سرد آہ بھری۔

''کتنا پاس آ گئے ہیں لیکن پھر بھی کتنے دور ہیں۔''

ناصر اپنی ٹکڑی کے ساتھ سکریٹریٹ کے نزدیک پہنچ گیا۔ رات کے وقت بھی سکریٹریٹ کی عمارت بجلی کی روشنی میں نہا رہی تھی۔ چاروں طرف سخت پہرہ تھا۔ عمارتوں کے اوپر بھی فوجی جوان مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔

ناصر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ہمیں کسی بھی طرح فوجیوں کی نگاہوں سے بچ کر سکریٹریٹ کی عمارت میں بم لگانے ہیں تا کہ ۱۰ ارمنٹ کے بعد جب سارے بم ایک ساتھ پھٹیں گے تب پوری عمارت زمین کے اندر ہوگی۔''

''لیکن پہرے کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ پہرے داروں کی نگاہوں سے بچا جا سکے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے کچھ لوگ ایک طرف سے فائرنگ کرتے رہیں تا کہ پوری فوج اس جانب متوجہ ہو جائے اور باقی ساتھی بم لگانے کے کام میں لگ جائیں۔'' ایک انقلابی نے مشورہ دیا۔

''تجویز مناسب ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

''یہی مناسب ہوگا۔''

''تو پھر چلو جان ہتھیلی پر لے کر۔ خاک وخون کی سرحدوں کے پار آزادی ہماری منتظر ہے۔''

''انقلاب......زندہ باد''

فائرنگ شروع ہوگئی۔ عمارت کے اوپر پہرہ دے رہے فوجی بھی تیار تھے جب انہوں نے دوسری طرف سے انقلابیوں کو سکریٹریٹ میں آتے دیکھا تو اوپر سے فائرنگ شروع کر دی۔ انقلابی جوش وجنون سے لبریز تھے اس لیے مرتے ہوئے بچتے ہوئے چاروں اور بم لگانے میں کامیاب ہوگئے۔ ایک طرف کچھ انقلابی متواتر فرئرنگ سے فوجیوں کو الجھائے ہوئے تھے۔ ناصر بم لگانے والوں کے ساتھ اوپر سے فائرنگ کر رہے فوجیوں کی گولیوں کا جواب دینے میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ایک گولی اس کے داہنے بازو کو گھائل کرتے ہوئے نکل

گئی۔ بازو خون سے بھر گیا۔ ناصر ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے محفوظ مقام کے لیے نکل پڑا۔

بنگلے کی دیوار پھاند کر ناصر ایک برآمدے کے سہارے کمرے میں داخل ہوا۔ بستر پر حسن کی ملکہ سو رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کا ہاتھ گلدان سے جا ٹکرایا۔ حسن کی ملکہ کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے بلب جلا دیا۔

''کون ہو تم.....؟''

ناصر کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''چپ رہو.....فوج میرا پیچھا کر رہی ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے آسرا چاہیے۔''

''چوری اور سینہ زوری۔''

''میں چور نہیں ہوں۔''

''تو کیا انقلابی ہو جو فوج تمہارا پیچھا کرے گی۔ جھوٹ مت بولو۔ آج کل ہر چور خود کو انقلابی کہہ کر گھر میں گھس جاتا ہے اور چوری کر کے فرار ہو جاتا ہے۔''

ناصر مسکرایا۔

''تو تمہیں ثبوت چاہیے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔''

ایک منٹ بعد خوفناک دھماکہ ہوا۔

''کیوں لڑکی ثبوت مل گیا۔''

''میرا نام نوشابہ ہے۔ یہ کیا تھا؟''

''تو تم لڑکی نہیں نوشابہ ہو۔''

نوشابہ کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔

''یہ کیسا دھماکہ تھا؟ شاید سکریٹریٹ کے آس پاس تھا۔''

''آس پاس نہیں، اسی میں دھماکہ تھا اور اب سکریٹریٹ زمین کے اوپر نہیں، زمین کے نیچے ہے۔ مجھے کچھ دیر یہاں رکنا پڑے گا۔''

''او.....کے۔''

ناصر نے پستول جیب میں رکھ لیا" ایک گلاس پانی ملے گا۔"

"ابھی لاتی ہوں۔"

ناصر کے بازو کا زخم اب اثر دکھانے لگا تھا۔ وہ سنبھل کر بیڈ پر بیٹھا کہ اسے غش آ گیا۔

نوشابہ پانی لے کر آئی۔" اوہ..... آپ کو کیا ہوا۔ اف یہ زخم میں ابھی چاچا جی کو بلاتی ہوں۔"

"چاچا جی۔"

"کیا ہوا بیٹی۔" فریدہ بھی اس کی آواز سن کر باہر آ گئی۔

"ایک انقلابی زخمی حالت میں میرے کمرے میں آ کر گر گیا ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

فریدہ بول پڑی۔" بالکل چلو۔"

ولی شاہ نے بھی کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... چلو۔"

ناصر کے زخم دھو کر پٹی کی گئی۔ انجکشن دیا گیا۔ وہ آرام کی نیند سو گیا۔

"زخم گہرا نہیں تھا۔ جب یہ نیند سے جاگے گا تو اچھا ہوگا۔ میں نیچے جاتا ہوں۔ تم دونوں یہیں رہ کر اس کا خیال رکھو۔"

ولی شاہ نیچے آیا۔ سامراجی افسر کی بات اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔

"افضل نہ سہی کسی انقلابی کو پکڑ لاؤ۔ میں ایک کی جگہ تین ٹھیکے دلوا دوں گا۔"

"اس سے اچھا موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔"

ضمیر سے آواز آئی۔ لیکن قوم سے غداری.... دولت کے لیے...... لیکن دولت سب کچھ ہے۔ دولت سے انقلابیوں کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ فی الحال اس کی گرفتاری ہو جائے تو اس کے ذریعہ کئی انقلابیوں کو خریدا جا سکتا ہے اور سامراجی حکومت کے دل میں جگہ بنا کر کروڑوں اربوں کمائے جا سکتے ہیں۔"

یہ خیال آتے ہی اس کی کانپتی انگلیوں نے فون پر امرجنسی نمبر ڈائل کیا۔

کمرے میں ناصر چین کی نیند سو رہا تھا۔ نوشابہ کی نظریں اسے نہار رہی تھیں۔

''تمہاری آنکھیں تمہارے عشق کی چغلی کھا رہی ہیں۔''

''کیا مطلب......نہیں تو.....''

''میری جان۔ جب مجھے میرے شوہر افضل سے سچا عشق ہوا تب سے ان کی تصویر کے آگے میری آنکھیں بھی ایسے ہی جھکتی ہیں جس طرح ابھی تمہاری آنکھیں اس کو دیکھ کر اور پتہ نہیں کیا کیا تصور کر کے شرم و حیا سے جھکی جا رہی ہیں۔''

کمرے کے سامنے تین آفیسر دبے قدموں آ کر کھڑے ہو گئے اور آہستہ سے دروازہ کھولا۔

نوشابہ اور فریدہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ ناصر کو گھیرے میں لینے کے بعد اس کے منہ پر پانی مارا گیا۔ ناصر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''اچھا تو وہ مسکراہٹ دولت کے لیے تھی۔''

نوشابہ اور فریدہ ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگیں۔

''لے چلو اسے۔''

فوجی ناصر کو لے کر چلے گئے اور جاتے جاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں ولی شاہ کو اشارہ کر گئے کہ اس کی خدمت کا سامراجی حکومت بہترین صلہ دے گی۔

''چاچا جی یہ آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ناصر کو پکڑوا کر.....''

''تمہارا ناصر.....؟ اچھا تو دونوں سہیلیاں انقلابی کی محبت میں پاگل ہو گئی ہیں جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں۔''

''ابا جان....وہ موت قوم کو بیچ کر خریدی گئی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ ذلت کی زندگی جس میں دولت کے محل تو ہوں لیکن اس کی بنیاد قوم سے غداری پر ہو۔ قوم کے جیالوں کے خون پر ہو۔''

''دولت سب سے بڑی چیز ہے۔ انقلابی کا سسر ہونے کے سبب شک کی بنا پر میرا جو ٹھیکہ مجھ سے چھین لیا گیا تھا، اب اس انقلابی کو پکڑوانے کے عوض مجھے تین تین ٹھیکے ملیں گے۔

میرا انتقام پورا ہوا۔''

''انتقام کی آگ میں آپ نے اپنی بیٹی کی خوشیاں بھی جلا دیں۔ مجھے آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔''

''چاچا جی اب میں ایک غدار کے یہاں ایک منٹ نہیں رک سکتی۔ میں جا رہی ہوں۔''

''نوشابہ میں بھی تمہارے ساتھ آ رہی ہوں۔''

ولی شاہ چیختا رہا۔ جیسے وحشی ہو گیا ہو۔

افضل سوچ رہا تھا۔ ابھی تک ناصر واپس نہیں آیا۔ کیا بات ہوئی۔

''کیپٹن، ناصر پکڑا گیا۔''

''کیسے، غفار کیسے....؟''

غفار نے سارا حال کہہ سنایا۔

''اچھا..... تو اس غدار کو پہلے سزائے موت دوں گا۔ اس کے بعد جیل پر حملہ ہوگا۔

افضل ولی شاہ کے بنگلے میں داخل ہوا۔ اس کی آہٹ سن کر ولی شاہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''شاید میری بیٹی واپس آ گئی۔'' اس نے دروازہ کھول دیا۔

''کون ہو تم؟''

افضل نے ہیٹ سے سر اوپر اٹھایا۔ ولی شاہ چیخ پڑا۔

''نہیں نہیں..... سسر باپ کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے کچھ مت کرنا۔''

''سسر..... باپ... قوم کے غداروں کی بس ایک سزا ہے۔ سزائے موت۔''

وہ بے تحاشہ بھاگا۔ لیکن افضل کی گولی سے نہیں بچ سکا۔

جیل پر سخت پہرہ تھا۔ گھومنے والا اسٹریٹ لائٹ جیسا بلب گھوم گھوم کر چاروں اور کے حالات دکھا رہا تھا۔ جیسے ہی بلب افضل اور اس کے ساتھیوں کے قریب آنے لگا۔ سب چھپ گئے بلب کی روشنی کے آگے جاتے ہی سب نے جیل کو گھیرے میں لے کر حملہ کر دیا۔ یہ نہایت خاموش حملہ تھا۔ ایک ایک کر کے کلوروفارم کے ذریعہ سپاہیوں کو بے ہوش کر کے ان کے

منھ اور ہاتھ باندھے جا رہے تھے۔ یکا یک افضل کو جیلر نظر آ گیا۔ جیلر کو قابو میں کر کے افضل نے اس کے کپڑے پہن لیے اور اپنے ایک ساتھی کو سپاہی کی وردی پہنا دی۔ جیلر کے ہیٹ کو اس طرح لگایا کہ چہرے کا کافی حصہ ڈھک گیا۔

جیل کے سپاہی نے دور سے جیلر کو ایک سپاہی کے ساتھ دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔ ایک بار اس نے سوچا کہ جیلر صاحب نے اس طرح ہیٹ کیوں لگایا ہے۔ پھر من ہی من بولا۔ بڑے لوگوں کا جیسا موڈ.....ان دونوں کے نزدیک آنے پر سپاہی نے سلیوٹ کیا۔ جیلر کے ساتھ والا سپاہی بولا۔

''اس انقلابی نے کچھ بتایا۔''

''نہیں۔ بڑا ہی سخت جان ہے۔''

''اس کو لے آؤ۔ اس سے جیلر صاحب خود کمرے میں پوچھ گچھ کریں گے۔''

''جی''

جیلر کے کمرے میں افضل نے ناصر کو گلے لگایا۔ اس کو سپاہی کی وردی پہنائی۔ ناصر مسلسل اذیت کے سبب کمزور نظر آ رہا تھا۔ افضل نے سپاہی کی وردی والے انقلابی سے کہا۔

''تم دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اپنا مشن پورا کرو۔ میں ناصر کو لے کر محفوظ جگہ جاتا ہوں۔ کل مرکز میں ملاقات ہوگی۔''

افضل اس کو لے کر ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ مرکز کی جانب جانے والی ٹرین کا ٹکٹ لیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور افضل اور ناصر وردی میں تھے، اس لیے دونوں کی اور کسی نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

ٹرین آٹھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ فریدہ اور نوشابہ اسٹیشن پر بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے ٹرین آ گئی۔ دونوں نے فرسٹ کلاس کے ڈبے پر پاؤں ہی رکھا تھا کہ پیچھے دو وردی پوش آ گئے اور ان کے بعد اسی ڈبے میں سامنے کی دونوں سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

فریدہ اور نوشابہ نے نقاب سے دونوں کی صورتیں دیکھیں تو خوشی اور حیرانی سے بت بنی رہ گئیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے ناصر۔''

''پہلے سے بہتر ہوں کیپٹن۔''

نوشابہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''تو آپ لوگ حکومت کے آفیسر نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہیں۔ اس لیے کہ آپ جیلر کی وردی میں ہیں اور یہ سپاہی کی وردی والا آپ کو کیپٹن کہہ رہا ہے۔''

''لڑکی۔ اپنے کام سے مطلب رکھو۔''

''وہی تو کر رہی ہوں۔ ہمیں جاننے کا پورا حق ہے کہ کہیں آپ برے آدمی تو نہیں ہیں۔ آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں۔''

''تمہارا کہنا درست ہے۔ ہم حکومت کے نہیں، قوم کے دلوں کے افسر ہیں۔ ان کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ ہم انقلابی ہیں۔ حکومت کے باغی۔''

''اچھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے دلوں پر بھی بادشاہت کرتے ہیں کیوں کہ ہم قوم کی بیٹیاں ہیں۔''

''بہت خوب۔'' افضل کی زبان سے یکا یک نکل پڑا۔

''اچھا آپ لوگ آ کہاں سے رہے ہیں اور یہ قوم کا سپاہی اتنا کمزور اور بیمار کیسے ہو گیا۔''

''ایک دولت کے لالچی غدار کی وجہ سے لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''کون؟''

افضل نے سارا واقعہ بیان کیا۔ فریدہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ یہ میری سہیلی دل کی کمزور ہے۔ کسی بھی حادثے کو سن کر جذباتی ہو جاتی ہے۔'' نوشابہ نے معاملہ سنبھالا۔

''قوم کے سورماؤں کی بیٹیاں دل کی اتنی کمزور نہیں ہوتیں۔ ضرور یہ اس غدار کی کوئی رشتہ دار یا جاننے والی ہے۔ اسے سمجھا دو کہ قوم کی بہادر بیٹیاں غداروں کے مرنے پر جشن مناتی ہیں، چیختی نہیں۔''

مرکز کا اسٹیشن نزدیک آرہا تھا۔ افضل نے ناصر کو سہارا دے کر اٹھایا۔ نوشابہ اور ناصر کی نظریں چار ہوئیں۔

''آپ سے ملنے کا ارادہ ہو تو کہاں ملاقات ہوگی۔'' نوشابہ نے دریافت کیا اور اس درمیان اس کا نقاب منہ سے سرک گیا۔ اسی درمیان اسٹیشن آ گیا اور ٹرین رک گئی۔

''ممکن ہے آزادی کے بعد کیونکہ سامراجی حکومت کے تابوت میں آخری کیل آج ہم نے ٹھونک دی۔ اب اس کی موت میں دیر نہیں۔'' افضل نے کہا اور ناصر کو سنبھالتے ہوئے ٹرین سے اترا۔ ناصر کی آنکھوں نے جب نوشابہ کو دیکھا تو اس کا چہرا غم و غصہ سے سرخ ہو گیا لیکن وہ بھی خاموشی سے نیچے اتر گیا۔

(۷)

افضل کی بات سچ ثابت ہوئی۔ سامراجی حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ملک انقلابیوں کے ہاتھ آ گیا۔ آزاد ملک.... آزاد ملک.... ہم آزاد ہو گئے..... آزادی مبارک.... انقلاب زندہ باد۔

کیپٹن افضل اب قوم کا ہیرو تھا۔ ملک کا سب سے بڑا لیڈر۔ انقلابیوں کی حکومت بن گئی۔

افضل اپنے دفتر میں بیٹھا لوگوں کے مسائل سن رہا تھا کہ دو برقعہ پوش عورتیں داخل ہوئیں۔

''ہمیں آپ کے قریبی ساتھی ناصر صاحب سے ملنا ہے۔ ہم ان کے دفتر نہیں جائیں گی۔ مہربانی کر کے انہیں یہاں ہی بلوا لیجیے۔ ہمیں آپ کے سامنے ہی ان سے کچھ بات کرنی ہے۔''

افضل حیران رہ گیا۔ اتنی بے باک عورتیں۔ لیکن اس کے لب خاموش رہے۔ اس نے سکریٹری کو اشارہ کیا۔ کچھ دیر میں ناصر وہاں آ گیا۔

''کیا بات ہے کیپٹن۔'' افضل نے بنا کچھ کہے دونوں عورتوں کی جانب اشارہ کر دیا۔ ان میں سے ایک نے اپنا برقعہ الٹ دیا۔

''تم...... یہاں..... کیا پھر سے دشمنوں سے گرفتار کروانے کا ارادہ ہے۔ چلی جاؤ یہاں سے۔''

''میری بات تو سنئے۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔''

''خبردار..... میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں۔''

''لیکن آپ کو اس کی بات سننی چاہیے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کوئی بات نہیں ہم یہاں سے چلی جائیں گی۔ اس دن فوجی اہلکاروں کو ہم نے نہیں، میرے ابا نے بلایا تھا جسے بعد میں آپ کے کیپٹن نے سزائے موت دی۔ ہمیں تو اس متعلق کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ ہم تو آپ کے کمرے میں تھے، آپ کی دیکھ بھال کے لیے۔ وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔''

''کیا'' دونوں ایک ساتھ بول پڑے۔

فریدہ نے بھی اپنا برقعہ الٹ دیا۔

''اس کے ابا میرے چاچا تھے۔ جو آپ کے کیپٹن کے سسر بھی تھے۔''

فریدہ بول پڑی۔

''میں تو اپنی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں لیکن آپ کو اس لیے سب کچھ بتا رہی ہوں کہ آپ بھی بعد میں حقیقت جان کر ندامت اور اپنے محبوب کی جدائی کی آگ میں جل کر خود کو مجرم نہ سمجھتے رہیں۔ یہ بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ بہت تکلیف دیہہ۔ میں جانتی ہوں، میں اس اذیت سے گزر رہی ہوں۔''

ناصر سے کچھ کہتے نہ بنا۔ نہ جانے اس کا دل کیوں نوشابہ کی بات پر ایمان لانا چاہتا تھا۔ آخر محبت کی جیت ہوئی اور وہ بے ساختہ نوشابہ سے گلے لگ گیا۔

فریدہ نے افضل کے پیر پکڑ لیے۔

''مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ کو سمجھنے میں بھول کی۔ میں تو اس لائق نہیں پھر بھی آپ سے گڑگڑا کر بھیک مانگتی ہوں کہ اپنی شریک حیات ہونے کا حق عطا کیجیے۔ مجھے اپنے دل میں جگہ دیجیے۔''

افضل ایک لمحے کے لیے بت بنا رہا پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

''آپ جا سکتی ہیں۔''

دونوں واپس چلی گئیں۔

راستے میں ناصر نے افضل سے کہا۔

''کیپٹن۔ نہ جانے کیوں مجھے نوشابہ کی باتوں میں سچائی نظر آئی اور قدم خود بہ خود

آگے بڑھ گئے۔ ہاتھوں نے خود بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ آپ سے کچھ مشورہ اور آپ کی اجازت تک کا انتظار نہیں کیا۔ آپ خفا تو نہیں۔''

''میرے دوست۔ سچے عشق میں کسی کے مشورے اور کسی کی اجازت یا حکم نامے کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ میں بہت خوش ہوں اور امید ہے کہ جلد ہی تمہاری بارات لے کر نوشابہ کے گھر جاؤں گا۔ تم دونوں کی جوڑی بنی رہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

''کیپٹن، اگر آپ خفا نہ ہوں اور اجازت دیں تو آپ سے کچھ عرض کروں۔''

''بالکل''

''سچا عشق تو میں نے فریدہ بھابھی کی باتوں میں بھی محسوس کیا۔''

''میرے پیارے یہ معاملہ ابھی یقین اور گمان کے درمیان ہے۔ ابھی اور ثبوت درکار ہیں۔''

ناصر خاموش ہو گیا۔ کار افضل کے سرکاری بنگلے میں داخل ہو گئی۔

اگلے دن افضل دفتر میں ضروری ہدایات دے کر فارغ ہوا تو یکایک اسے جمال، رضیہ، رخسانہ اور بشیر یاد آ گئے۔

ابا سے ملے کافی دن ہو گئے۔ ملک کی آزادی کے بعد مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ...... جلد ہی ان سے ملنے جانا چاہیے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ چپراسی اندر آیا۔

''سر کچھ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اپائنٹمنٹ بھی نہیں ہے لیکن پتہ نہیں کیوں ان کو اندر آنے دیا گیا۔ میں نے پرچی پر نام لکھ کر دینے کو کہا تو بھی منع کر دیا۔ کہتے ہیں کیپٹن ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں''

''کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں، یہ تو پوچھ کر آؤ۔''

چپراسی دوبارہ اندر آیا۔ ''جی وہ جو......وہ جو......آپ کے.......''

''ہاں ہاں بلا جھجک بتاؤ۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

چپراسی نے ہمت جتاتے ہوئے کہا۔

''وہ جو آپ کے ماں باپ ملنے کی خبر اخبار میں چھپی تھی آزادی سے پہلے، اسی سلسلے میں لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''اچھا۔ ہاں اس وقت چونکہ آزادی کی آخری لڑائی چل رہی تھی، اس لیے میں اس جانب نہ کسی سے بات کر سکا اور نہ کچھ دریافت کر سکا۔ نہ ہی اخبار کی وہ خبر ہی پڑھ سکا کہ اصل میں لکھا کیا تھا۔ بس کچھ لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ میرے ماں باپ مل گئے ہیں۔ بہر حال انہیں اندر بلاؤ۔''

جمال، رقیہ، رضیہ، رخسانہ، اجمل اور بشیر کمرے میں داخل ہوئے۔

''ارے ابا جان آپ''.....افضل دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا۔

جمال نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔''خوش رہ میرے شیر۔''

''آپ کا شیر، آپ کا بیٹا۔''

''بالکل۔لیکن میں تیری جنم دینے والی ماں کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تیرے والد بھی آئے ہیں۔ان سے ملو اور ان کی دعائیں لو۔''

''اتنے برسوں بعد انہیں میری یاد کیسے آ گئی۔''

اجمل نے جو کچھ بھی اخبار میں چھپوایا تھا، وہ سارا قصہ بیان کیا۔ افضل نے جمال سے کہا۔

''ابا جان۔ جو آدمی زندگی کی چھوٹی سی مشکل آنے پر اپنی اولاد کو کسی کے حوالے کر دے اور پھر ایک عرصہ تک اسے بھولا رہے اور جب وہ ناجائز بچہ وقت کی اذیتوں کو سہتا ہوا کسی مہربان کے سائے میں پل کر جوان ہو جائے، مشہور ہو جائے اور یہاں تک کہ سماج اور معاشرے کی اہم شخصیت بن جائے۔ اس وقت اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈتے ہوئے آئیں اور اسے ایک کہانی سنائیں، ایسی کہانی سنانے والا کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن آپ کے شیر بیٹے کا باپ نہیں ہو سکتا۔ کہانی کچھ اور ہے۔''

''افضل۔''

رقیہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی لیکن افضل تک آتے آتے اس چیخ کا دم گھٹ گیا۔

''دیکھا ابا جان۔ میری بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس عورت کی چیخ میں ناجائز بچہ پیدا کرنے کی ہنک تو ہے لیکن اپنی کوکھ سے پیدا ہوئی اولاد کے لیے کوئی رحم، کوئی درد نہیں۔''

رقیہ کا چہرا ندامت سے جھک گیا۔

''ابا جان ویسے تو مجھے اب ان رشتوں کی نہ کوئی چاہت ہے اور نہ ضرورت۔ آپ میرے ماں باپ سب کچھ ہیں۔ میں نے آج تک آپ کا حکم نہیں ٹالا۔ آج بھی نہیں ٹالوں گا۔ لیکن آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتا ہوں کہ مجھے اصل کہانی، اصل واقعہ، اصل حقیقت بتائیے کہ کیا ہوا تھا۔ میری رگوں میں کس کا خون ہے۔ کن حالات سے مجبور ہوکر مجھے آپ کے سپرد کیا گیا۔ آپ اپنے شیر بیٹے کا یقین کریں۔ اگر آپ سے بھی میرے لیے کوئی گناہ ہوا ہوگا، کوئی خطا ہوئی ہوگی تو بھی میں اف تک نہیں کروں گا لیکن خدا کے لیے آپ مجھے آج اصل سچائی بتائیے۔''

جمال سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

''میرے اور میرے شیر بیٹے افضل کے علاوہ جتنے لوگ ہیں، سب ہمیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔'' سب لوگ باہر چلے گئے۔

''بیٹا۔ میں جو کبھی تیرے نانا کا معمولی نوکر ہوا کرتا تھا اور آج کروڑ پتی ہوں۔ یہ سب کچھ تیرا صدقہ ہی تو ہے۔'' اور اس کے بعد اول تا آخر سارا واقعہ بیان کرکے جمال افضل سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔

افضل رنجیدہ ہوکر کچھ سوچنے لگا۔ یکا یک وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور جمال سے کہا۔

''ابا جان سب کو بلایئے۔''

سب اندر آ گئے۔ افضل نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

''میرے ناجائز نانا نے اپنی جائز بیٹی کو بدنامی سے بچانے اور اس کی تقدیر سنوارنے کے لیے جمال صاحب کی بھی تقدیر سنوار دی اور مجھ سے پیچھا چھڑا لیا۔ یا یوں کہیں کہ اپنے خاندان سے میرا نام و نشان تک مٹا دیا۔ جمال صاحب کے لیے میں لکی ثابت ہوا کہ وہ مجھے پاکر پل بھر میں مفلس سے دولت مند ہو گئے اور ان کے اس عقیدے نے کہ میرا ان کے لیے لکی

ہونا انہیں اور بھی دولتمند بنادے گا، مجھے زندہ رہنے کا ایک موقع عطا کیا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اگر ان کا عقیدہ رضیہ امی کی طرح ہوتا تو میرا کیا ہوتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کو کاروبار میں بہت فائدہ نہ بھی ہوتا اور وہ بہت زیادہ ترقی نہ بھی کرتے تو ان کی فطرت ایسی ہے کہ شاید مجھے اتنا ہی پیار ان سے ملتا جتنا کہ آج تک ملا۔ ہاں اگر کاروبار میں لگا تار نقصان ہوتا تو ان کا رویہ کیا ہوتا، ان کا عقیدہ کیا ہوتا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ مجھے جنم دے کر بھول جانے والی ناجائز ماں رقیہ کو بھی جب قدرت نے دوبارہ اولاد نہ دی اور یہ طے ہو گیا کہ وہ ہمیشہ اولاد کی نعمت سے محروم رہیں گی تو یکایک انہیں اپنے اس ناجائز بیٹے کی یاد آئی اور وہ ان کے لیے پل بھر میں جائز ہو گیا۔

اس جائز ناجائز کے چکر نے میری زندگی ہی اجیرن کر دی۔ اب میں اس چکر کو یہیں ختم کر دوں گا۔ آپ لوگ اب زندگی میں کبھی بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔ جمال ابا جان میرے سب کچھ ہیں۔ وہی میری ماں، وہی میرے باپ ہیں۔ ان کے علاوہ میں کسی رشتے کو نہیں جانتا۔ میں جائز ناجائز جو بھی ہوں، انہیں کی اولاد ہوں۔ انہیں کی کاوشوں سے میری زندگی میں فریدہ نام کی بہار آئی لیکن جائز ناجائز کے چکر نے اس کی محبت کو بھی مجھ سے دور کر دیا۔ اب سب لوگ چلے جائیے۔'' یہ کہہ کر افضل نے اپنا چہرا اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

لوگ افضل کے کمرے سے ندامت کے آنسو لے کر رخصت ہو گئے۔ جمال وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں فریدہ آ گئی۔ فریدہ کو دیکھ کر جمال کے دل میں کچھ خیال آیا اور اس نے فریدہ کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھایا اور کمرے سے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔

فریدہ نے افضل کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ افضل نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ افضل نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس کی آنکھوں سے ندامت اور سچی محبت ٹپک رہی تھی۔ افضل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے اپنا چہرا فریدہ کے سینے کے درمیان رکھ دیا۔ اسے کچھ سکون حاصل ہوا۔ فریدہ نے اس کے چہرے کو اپنے سینے میں زور سے دبایا اور اس کی آنکھوں کے آنسو اپنی آنکھوں میں جذب کر لیے۔

فطرت.....محبت......ندامت

(۱)

سورج کو ڈوبے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر نگر کی وحشت گلی میں ایک لمبے قد کا آدمی داخل ہوا۔ خوبصورت چہرا لیکن اتنا بارعب کہ پہلی بار دیکھنے والا وحشت سے چونک پڑے۔ سوٹ میں ملبوس، پاؤں میں انگریزی بوٹ۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔

''مکان نمبر ۲۰۔''

وہ لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا مکان نمبر ۲۰ کے پاس رکا اور دروازے کی گھنٹی بجائی۔

اندر سے ایک آدمی آیا۔

''آپ کا مکان ہے۔''

''ہاں جناب، خاکسار کا ہی ہے۔''

''مجھے انوکھے خان نے بھیجا ہے۔''

''او'' وہ چونک پڑا۔

''تو آپ امین صاحب ہیں۔ معاف کیجیے میں نے آپ کو پوری طرح پہچانا نہیں لیکن آپ کا چہرہ کچھ مانوس لگنے کے سبب میں ایک پل کے لیے پرانی یادوں میں کھو گیا۔''

''یادیں..... ہاں دوست۔ یادوں کے سہارے ہی انسان زندہ رہتا ہے۔''

''یہ سوٹ کیس مجھے دیجیے اور اندر چلیے۔''

دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ پرانے طرز کا مکان۔ ایک باورچی خانہ، ایک ڈرائنگ روم، اور دو بیڈ روم۔ مکان چھوٹا مگر صاف ستھرا۔ سامنے ایک چھوٹا سا باغ جس میں رنگ برنگ کے پھول۔

''مکان پسند آیا۔''

''ہاں..... مجھے بھوک لگی ہے۔ تم میرے لیے کچھ کھانے کا انتظام کر سکتے ہو۔''

''ابھی..... ابھی کرتا ہوں جناب۔ تب تک آپ غسل کر لیں۔''

مکان مالک باہر آیا اور سڑک کی جانب مڑا کہ یکا یک اسے کسی نے آواز دی۔

''لالو..... لالو.....''

''کیا بات ہے۔''

یہ تمہارے مکان میں کون آیا ہے۔''

''وہ...... وہ میرا نیا کرائے دار ہے۔''

''لیکن وہ بھلا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔''

''وہ بھلا آدمی ہے لیکن بڑا دکھی ہے۔''

''لیکن اس کے اطوار سے تو ایسا نہیں لگتا۔''

''جب آدمی کے لیے مایوس کن حالات پیدا ہوتے ہیں تب ہر ایک اسے برا ہی سمجھتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔''

''اچھا'' یہ کہتے ہوئے لالو سامنے والے ہوٹل میں گیا اور امین کے لیے کھانا لیا۔ کھانا لے کر گھر آیا اور میز پر لگا دیا۔

امین غسل خانے سے باہر آیا۔

''کھانا۔''

''جی وہ میز پر۔''

''اچھا''

''کھانا بہت اچھا ہے۔''

''شکریہ جناب۔''

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''جی میرا نام تو ویسے جمال ہے لیکن لوگ لالو کہہ کر پکارتے ہیں۔''

جمال کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ ماں باپ گزر چکے تھے۔ شادی بھی نہیں کی تھی۔ تنہا تھا۔ مست اور رنگین طبیعت۔ اس کے باپ نے دو مکان چھوڑے تھے جن کے کمروں کو کرائے پر اٹھا کر وہ اچھی آمدنی کر لیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد امین پلنگ پر آ گیا۔

''صاحب..... میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ مرد کے پیٹ کی جب آگ بجھتی ہے تو اس کے جسم کی آگ جل اٹھتی ہے اور اسے بجھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

''تو''

''تو صاحب..... وہ لال پری ہے۔ کیا حسن پایا ہے۔ جس نے اس کا قرب حاصل کیا وہ جنت میں پہنچ گیا۔ نام بھی اس کا کس قدر خوبصورت ہے شوانگ رانی۔ اس کی پورے شہر میں دھوم ہے۔''

''جمال..... میں ابھی بہت تھکا ہوا ہوں اور اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے تم ایسا کرو کل شام کو آ جاؤ۔ اس وقت تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ اور ہاں برتن اٹھا کر لے جاؤ۔ یہ لو کھانے کے پیسے۔''

''جی بہت اچھا۔ کل شام کو حاضر ہوتا ہوں۔''

(۲)

جمال مکان میں داخل ہوا۔ امین ابھی تک نیند میں تھا۔ دروازے کی گھنٹی سن کر آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''اٹھئے جناب شام ہوگئی۔''

''ہوں۔''

''ارے لگتا ہے کہ آپ سارا دن سوتے ہی رہے اور دن کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے اس کا احساس تھا اسی لیے کھانا میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں منھ ہاتھ دھولوں۔''

جمال نے امین کے کھلے ہوئے سوٹ کیس کے اوپر ایک کتاب دیکھی۔ اس نے سوچا کہ جب تک امین کھانے سے فارغ ہو، وہ اس کو الٹ پلٹ کر دیکھے۔ لیکن وہ کتاب میں اس قدر کھو گیا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ امین نے کب کھانا ختم کیا۔

''کہاں کھو گئے جناب......جمال۔''

''ہوں.....اچھا تو آپ نے کھانا بھی کھالیا۔ دراصل یہ کتاب اتنی اچھی اور دلچسپ ہے کہ میں اس میں کھو گیا۔ ہاں.....طوائف رانی کے یہاں چلنا ہے۔ وہاں آج آپ کے لیے گانا ہوگا۔''

''میرے لیے نہیں، میرے پیسوں کے لیے گانا ہوگا۔''

''ایک ہی بات ہے جناب۔ آخر پیسے بھی تو آپ ہی کے ہیں۔''

وہ دونوں شریف گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں ہر مکان میں حسن و جوانی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جمال ایک مکان کے سامنے رک گیا۔

''طوائف رانی کا گھر۔''

''مکان تو اچھا ہے لیکن مجھے طوائف رانی کو دیکھنا ہے۔''

دونوں اندر داخل ہوئے۔ایک بڑا کمرہ قالین سے سجا ہوا۔سات آٹھ تکیے۔بوڑھی آپا پان چبا رہی تھی۔جمال نے اسے سلام کیا۔

''یہ میرے مالک امین صاحب ہیں۔''

''آداب۔''

''شاہ خود آئے ہیں آپا۔تو اب دیر کس بات کی ہے۔''

''اچھا جناب۔بیٹی باہر آجاؤ،مہمان آگئے ہیں۔''

طوائف بائی اوپر سے نیچے تک گہنوں میں لدی ہوئی تھی۔حسن بے پناہ نے اسے چودھویں کا چاند بنا دیا تھا۔اس نے امین صاحب کے سامنے پان کی گلوری رکھی۔

''آداب۔''

امین صاحب حسن سے متاثر ہوئے،اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۱۰۔۱۰ کے ۲۰ نوٹ رکھے۔پورے ۲۰۰ روپئے۔

''طوائف رانی اپنی اداؤں اور ترنم بھری آواز سے محفل کو مستی کے عالم میں تبدیل کر دیجیے۔''

''جو حکم۔''

اگر یہ حسن میرا پیار کے شعلوں میں ڈھل جائے
تو پھر انسان ہے کیا چیز پتھر بھی پگھل جائے

اس نے دو چار گانے گائے۔جمال صاحب رات کے کھانے کا انتظام کرنے چلے گئے۔بوڑھی آپا نے بھی دونوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''طوائف رانی۔''

''اصلی نام۔''

''اب تو یہی اصلی نام ہے۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا۔''ویسے تو میرا نام شبنم تھا۔''

''شبنم...'' میں تو پرانی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں... لیکن... وہ پھر یاد آ گئی۔

(۳)

امین کو پوری طرح نہ تو ماں کا پیار مل سکا اور نہ باپ کا۔ امیر ترین گھرانہ، باپ کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں تھی اور ماں کو اپنی سہیلیوں اور پارٹیوں سے۔ اس کے باپ کا ایک منشی رنگین شاہ تھا۔ اپنے نام کے اعتبار سے ہی رنگین۔ اس کی نظر اپنے مالک کی دولت پر تھی۔ اس نے دوستی بڑھاتے ہوئے امین کے باپ کو شراب اور شباب کی لت لگائی اور اس کی ماں کو بھی اپنے پیار کے جال میں پھانس لیا۔ پھر ایک دوسرے کی مخبری شروع کر دی۔ ایک کا راز دوسرے کو بتانے لگا جس سے گھر کا امن وسکون درہم برہم ہو گیا۔ ایک دن امین کی ماں نے اپنے شوہر کو دوسری لڑکی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ خوب ہنگامہ ہوا۔ امین کے باپ نے اپنی غلطی مان لی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ایک دن امین کے باپ نے اس کی ماں کو غیر مرد کے ساتھ اپنے بستر میں پایا۔ لیکن اس مرد کا چہرا نہ دیکھ سکا۔ چونکہ یہ رنگین شاہ کی سوچی سمجھی چال تھی اس لیے اس نے پہلے ہی پوری تیاری کر لی تھی۔ امین کا باپ صرف اس کی ننگی پیٹھ دیکھ سکا اور وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ امین کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دے دیا اور خود شراب اور شباب میں ڈوب کر جلد ہی جہاں فانی سے چلا گیا۔ کاروبار اب امین کے ہاتھ میں تھا اور اسے بھی رنگین شاہ نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ رنگین شاہ پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتا تھا۔ ایک دن امین پرانا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔

''بیٹا، کبھی اپنے دماغ کو آرام بھی دیا کرو۔''

''چچا جان، آرام کام کے بعد۔''

''بیٹا تم میری طرح بوڑھے نہیں ہو۔ خوبصورت جوان ہو۔ جوانی کے دن لوٹ کر نہیں آتے۔ تمہارے ابا مرحوم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ زندگی چار دن کی ہے تو کیوں نہ اسے عیش

کے عالم میں گزارا جائے۔ آؤ آج میں تمہیں دنیا کا ایک نرالا کھیل دکھاؤں گا۔ چلو۔''

''کہاں۔''

''آؤ تو میرے ساتھ۔''

رات کے اندھیرے میں وہ دونوں ایک حویلی میں داخل ہوئے۔

''چچا جان، ہم یہاں کیوں آئے؟ یہاں کیا ہے؟''

''بیٹا یہاں وہ آب حیات ہے جس سے تمہاری جنم جنم کی پیاس بجھ جائے گی۔''

حسن کے انمول موتی نے رقص شروع کیا۔ امین کا دل اچھلنے لگا۔ عورت کا سامنا اس طرح پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نازک حسینہ نے جب شراب کا جام پیش کیا تو امین نے کہا۔

''نہیں...... میں .... نہیں ...... پیتا۔''

''ارے بیٹا۔ زندگی کا اصل راز تو اسی جام میں چھپا ہوا ہے۔ پی لو اور جنت کی سیر کر لو۔''

''لیکن ......''

''میری قسم۔'' نازک حسینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ جام پی گیا جو بہت تلخ تھا۔ لیکن پھر وہ مستی کے عالم میں ڈوب گیا۔ عورت کے نرم جسم نے اسے جوانی کے انمول ہونے کا احساس دلایا۔ آہستہ آہستہ شراب اور شباب اس کی زندگی کا اہم حصہ بن گئے۔ رنگین شاہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اب امین کی راتیں طوائفوں کے جسموں کے ساتھ ہی گزرتی تھیں۔

(۴)

عمر کے تقاضے انسان کو کبھی کبھی کچھ مسئلے حل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ امین کو بھی ایک ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا۔ رنگین شاہ نے کہا۔

''شادی تمہیں کرنی پڑے گی۔''

''لیکن میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔''

''دیکھو بیٹے شادی انسانی زندگی کا اہم جز ہے۔ انسان کی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ ہمیں سماج میں رہنا ہے۔ ہم اس سماج کا حصہ ہیں تو عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے کچھ سماجی روایتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی نباہنا پڑتا ہے۔ تمہارا ابھی کوئی نام لیوا ہونا چاہیے۔ ہم سب کو ایک دن اس فانی دنیا سے جانا ہے لیکن کیا خاندان کا نام مٹا کر جاؤ گے۔ اور پھر نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا ہے۔''

''نادر موقع......؟ کیا مطلب؟''

''ایک حسین ترین لڑکی ہے۔ اونچا خاندان اور سب سے اچھی بات کہ وہ جہیز میں تیس ہزار روپئے نقد دے رہے ہیں۔''

''روپئے کی بات نہیں۔ لڑکی کیسی ہے۔''

''ارے بھائی حسین لڑکی ہے، خوبصورت۔ اس کے ساتھ دولت بھی مل رہی ہے۔''

''مجھے دولت کی پرواہ نہیں۔''

''نہیں بیٹے، دولت کی پرواہ ہونی چاہیے۔ اس سے انسان کی سماج میں عزت اور مقام ہے۔ جس کے پاس دولت نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ دبتا رہتا ہے۔''

''لیکن میں لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کروں گا۔''

ٹھیک ہے۔ کل تم کو شاہ دین کے یہاں دعوت پر جانا ہے۔ وہاں وہ بھی آئے گی۔

وہیں ملاقات کا بندوبست کرتے ہیں۔

(۵)

امین شاہ دین کے یہاں جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ رنگین شاہ نے کہا۔

"بیٹے میں نے مغلانی کو کہا ہے کہ ٹھیک سات بجے وہ شاہ دین کی حویلی کے پیچھے والے باغ میں شبنم بیٹی کو لائے۔ وہاں آپ بھی جائیں اور اسے جی بھر کر دیکھ لیں۔"

امین شاہ دین کے یہاں دعوت میں جاتے ہوئے راستے میں نہ جانے کیوں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اب تک بہت سے پھولوں کا رس چوسا تھا لیکن شبنم کے لیے نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ دین کی حویلی جگمگا رہی تھی۔ روشنی نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔

مغلانی عورتوں کی محفل میں داخل ہوتی ہوئی شبنم کے پاس جا پہنچی۔

"شبنم۔"

"جی۔"

"یہاں تو بڑی گرمی ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو باغ میں ہم چہل قدمی کر آتے ہیں۔ تاکہ دماغ تازہ ہو جائے۔"

"لیکن وہاں تو آدمی ہوں گے۔"

"ارے بی بی۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ اس طرف آدمیوں کا آنا جانا بند کیا گیا ہے۔ آؤ بھی۔"

"لیکن......"

مغلانی اسے تقریباً کھینچتے ہوئے باغ میں لے آئی۔

"میں نے سنا ہے تری شادی ہو رہی ہے۔"

''ہاں۔''

''تم نے دولہے کو دیکھا۔ تمہیں پسند ہے۔''

''ماں باپ کی پسند ہی میری پسند ہوگی۔ مجھے دولہا دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ماں باپ جس کے ساتھ ہاتھ پکڑا دیں گے چلی جاؤں گی۔''

امین درخت کے پیچھے سے شبنم کو دیکھ رہا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ وہ اس نازک حسینہ کا ہونے والا خاوند تھا۔ اس کے باغ سے باہر آنے پر رنگین شاہ نے پوچھا۔

''کیوں.... دیکھ لیا، لڑکی پسند آئی۔''

''ہاں چاچا۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی ذہین بھی ہے۔ آپ جلدی رشتہ پکہ کیجیے اور ہاں نقدی کا بھی خیال رکھئے گا۔''

''ہوں..... بیٹا اب عقلمند ہو گیا ہے۔''

(۶)

اکبر خاں کی بڑی حویلی کے سامنے ایک باغ تھا۔ پورے شہر میں یہ سب سے اچھا اور خوبصورت مانا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا نام لوگوں نے دلفریب رکھا تھا۔

رنگین شاہ نے حویلی کے اندر داخل ہوتے ہوئے اکبر خاں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ آیئے، رنگین شاہ صاحب۔ فرمایئے۔''

''جی حضور میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ جو بات ہمارے درمیان ہوئی تھی، اسے آگے بڑھایا جا سکے۔''

''تو آپ نے امین صاحب سے بات چیت کی۔''

''جی ہاں۔ بڑا فرمانبردار لڑکا ہے۔ مان گیا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

''ہمارے آپ کے درمیان ایک اور بات ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔ ۳۰ ر ہزار روپئے کی۔ آپ اس کے لیے بےفکر رہیں۔''

''تو پھر جمعہ کے دن منگنی کر دیتے ہیں اور اگلے ماہ شادی۔''

''آپ امین صاحب سے مشورہ کر لیجیے۔''

''آپ سمجھ لیجیے کہ یہ امین صاحب کی ہی بات ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ایک ماہ کے اندر ہم بھی شادی کی اچھی طرح تیاری کر سکتے ہیں۔''

(۷)

سگائی کے اخراجات ایک عام آدمی کی شادی کے اخراجات کے برابر تھے۔ دونوں طرف سے دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کا فائدہ اٹھا کر رنگین شاہ کافی پیسے بچا رہا تھا لیکن اکبر خان بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا۔

دلہن کے گھر میں دولہے کا شاندار استقبال ہوا۔ اسے بہترین مسند پر بٹھایا گیا، نکاح ہوا۔ امین کے قریبی دوست انور بیگ نے کہا۔

''یار آج وہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔''

''کیوں۔''

''یہ روایت ہے۔ دلہن کو اس دن صرف گھر لایا جاتا ہے۔ سہاگ کا کمرہ دوسری رات ملتا ہے، وجہ شاید یہ ہے کہ دلہن، دولہا بہت تھکے ہوتے ہیں۔''

''اف..... میرا دل چاہتا ہے کہ ابھی اس باریک پردے کو کاٹ دوں جس کے پیچھے دلہن ہے اور اسی وقت سہاگ رات منا لوں..... خیر.....''

''دلہن کو ڈولے میں سوار کیا گیا۔ وہ اپنے ماں باپ سبھی رشتہ داروں کو چھوڑ کر شوہر کے گھر چلی آئی۔'' یہاں بھی گانا بجانا ہوتا رہا۔

دوسرے دن رات کو امین نے شبنم کا گھونگھٹ اٹھایا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

''اف اس قدر حسن۔''

اس نے نرم آواز میں پکارا۔

''شبنم۔''

شبنم نے ڈر اور شرم کے ملے جلے لہجے میں اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی

آنکھوں کی معصومیت نے امین کو گھیرے میں لے لیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔

(۸)

یہ سچ ہے کہ کسی شریر بچے کو کوئی نیا حسین کھلونا مل جائے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے بہل جاتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اسی شرارت پر اتر آتا ہے اور ادھر ادھر دوسرے کھلونوں کی جانب بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ امین کی شرارت بھی کچھ دنوں تک شبنم نامی کھلونے سے بہلی رہی۔ لیکن اس کی گندی فطرت نے پھر کروٹ لی اور اس کا ہر روز رات دیر سے آنا شروع ہو گیا۔ ایک دن شبنم نے شکایت کی۔

''آپ ہر دن دیر سے آتے ہیں۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔''

''کیا کروں بیگم۔ میرے دوست ضدی ہیں۔ وہ محفل جمانے کے بعد مجھے اٹھنے ہی نہیں دیتے۔''

''لیکن آج کل جلدی آجایا کیجیے، میری طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔''

''کیا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔''

شبنم کی آنکھوں میں شرم اور ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔

''ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں، آپ باپ بننے والے ہیں۔''

امین خوشی سے ناچ اٹھا۔ شبنم کو بانہوں میں بھر لیا۔

''آپ وعدہ کیجیے کہ اب دیر سے نہیں آئیں گے۔ محفل سے تھوڑا جلدی ہی اٹھ جائیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

(۹)

شبنم نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ امین لڑکا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اس کے لڑکے کا باپ بننے کا خواب پاش پاش ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ لیکن وہ شبنم سے کیے ہوئے وعدہ کو برقرار نہ رکھ سکا۔ آخر شرابی کے وعدہ کا بھی کیا بھروسہ۔

دو سال اسی طرح بیت گئے۔ شبنم دوبارہ ماں بننے والی تھی، اس بار امین نے کہا۔

''دیکھو بیگم۔ اس بار ہمیں بیٹا چاہیے۔''

''جو خدا کو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔''

''تم دعا کرو۔ خدا تمہاری دعا سے لڑکی کو لڑکے میں تبدیل کر دے گا۔ خدا نیک بندوں کی سنتا ہے۔ بیگم تم بھی نیک ہو۔ وہ تمہاری دعائیں ضرور قبول کرے گا۔''

دو ماہ بعد شبنم کو لڑکا ہوا۔ امین خوشی سے جھوم اٹھا، اس نے لڑکے کو ہاتھ میں لے کر پیار کیا اور ایک قیمتی لاکٹ اس کے گلے میں ڈال دیا۔

''آپ نے اتنا قیمتی لاکٹ اس چھوٹے سے بچے کو پہنایا ابھی تو......''

''ارے بیگم یہ بھی تو دیکھو کہ بیٹا کس کا ہے۔''

رات کو امین کی حویلی میں ناچ گانا ہوا۔ کچھ دوستوں نے ضد کر کے پلائی۔ کچھ وہ خود بھی خوشی میں پی گیا۔ بہکے قدم.... نشے میں ڈوبی آواز.....

''آپ..... آپ نے شراب پی لی۔'' شبنم کے چہرے پر نفرت اور حقارت پھیل گئی۔

''بس بیگم آج اتنی خوشی کا دن تھا کہ دوستوں نے پینے کے لیے مجبور کر دیا۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔

(۱۰)

دوستوں کی محفلیں اب حویلی کے اندر بھی جمنے لگیں۔ دھیرے دھیرے یہ روز کا معمول بن گیا۔ نئی نئی کمسن لڑکیاں حویلی میں آتی تھیں۔ شبنم اس نئی حالت کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اس نے جب بھی احتجاج کیا امین نے موٹے موٹے آنسوؤں سے اس کو رام کر دیا۔ لیکن کب تک۔ جلد ہی شبنم نے تیسرے بچے کو جنم دیا۔ چونکہ امین کا لڑکے کا باپ بننے کا خواب پورا ہو چکا تھا اس لیے اس نے اس جانب کوئی توجہ نہ کی۔ وہ اس رات بھی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا۔ گھر کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ شبنم اپنے بچوں کی تربیت ایسے گندے ماحول میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن آخری فیصلہ کر کے وہ امین کی غیر موجودگی میں اپنے بچوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر کے لیے نکل پڑی۔ ملازموں نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔ وہ ریل گاڑی میں سوار ہوئی۔ راستے میں ایک بڑا پل پڑتا تھا۔ ریل اس پر سے گزر رہی تھی کہ پل ٹوٹ گیا۔ ریل کے ٹکڑے ہو گئے۔

(۱۱)

امین شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ شبنم اور بچوں کو نہ پا کر اس نے ملازم کو بلایا۔

''کیوں بے..... مالکن کہاں ہیں؟''

''جناب وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئیں۔''

''کیوں....؟''

''آپ کا یہ رنگ ڈھنگ وہ برداشت نہ کر سکیں۔''

امین کا نشہ کافور ہو گیا۔

''ابے کم عقل۔ تم نے جانے کیوں دیا۔ اب کیا ہوگا۔ چلو ہم ابھی چلتے ہیں اور اکبر صاحب سے کوئی بہانہ بنا کر منت سماجت کر کے ان کو واپس لائیں گے۔ جلدی چلو۔''

وہ دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹکٹ کھڑکی پر امین نے کہا۔

''سولن کی دو ٹکٹیں۔''

''سولن کی..... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سولن کا پل ٹوٹ گیا ہے اور صبح جو گاڑی سولن جا رہی تھی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔''

''کیا..... اور..... اور..... ان میں جو سواریاں تھیں، ان کا کیا ہوا؟''

''ابھی تک پتہ نہیں کہ کتنے مرے اور کتنے زندہ ہیں۔''

''نہیں...... شبنم...... میرے بچے....''

دوسرے دن وہ حادثے کے مقام پر پہنچا۔ لاشیں نکالی جا رہی تھیں اور شناخت کروائی جا رہی تھیں۔ امین کی حالت غیر معمولی طور پر تبدیل تھی۔ بال بکھرے، داڑھی بڑھی

ہوئی۔ وہ اس وقت ٹوٹ گیا جب شبنم اور اس کے چھوٹے بیٹے کی لاش ملی۔ بیٹی اور بڑے بیٹے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ شبنم اور بچے کو سپرد خاک کیا گیا۔ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس کا دوست انو کھے خان اسے دلاسہ دینے لگا۔

''زندگی تو مصیبتوں کا مجموعہ ہے۔ وقت کے ساتھ زخم بھر جاتے ہیں۔''

''نہیں یار..... میں نے اپنی بیوی کی قدر نہ کی جو ہر وقت مجھ پر سب کچھ فدا کرنے کو تیار رہتی تھی۔ میں وہی عیاشی کا کیڑا رہا۔ نہ جانے میری بیٹی اور بیٹے کا کیا حال ہوگا۔''

''جہاں بھی ہوں گے اچھے ہی ہوں گے۔ تم کوئی غلط خیال دماغ میں نہ لاؤ۔ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم ہوا پانی بدل دو۔ ایسا کرتے ہیں کہ سمندر نگر میں میرا ایک دوست ہے۔ اس کے دو مکان ہیں جن کو وہ کرائے پر چلاتا ہے۔ میں اسے کل خط لکھ دیتا ہوں۔ وہ ایک مکان تمہیں کرائے پر دے دے گا۔ تم جب تک چاہو، وہاں رہنا۔ پھر آ جانا۔''

امین نے کچھ سوچتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور سمندر نگر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

(۱۲)

''کس سوچ میں ڈوب گئے۔''شبنم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔''امین یادوں کی دنیا سے باہر آیا اور شبنم کے حسن کو نہارنے لگا۔اس کی بیوی شبنم خواب تھی،اس کی نظروں کے سامنے جو شبنم تھی وہ حقیقت۔ایک بار پھر اس کی گندی فطرت نے انگڑائی لی اور وہ سب کچھ بھول کر طوائف رانی کے نرم جسم کی سیر میں ڈوب گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے کپڑے پہنے۔باہر نکل ہی رہا تھا کہ جمال آ گیا۔

''آخر آپ پر بھی طوائف رانی کا جادو چل ہی گیا۔''

''جمال تم بہت باتیں کرنے لگے ہو۔''طوائف رانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جمال آؤ چلیں۔''

''آپ چلئے حضور میں ابھی آتا ہوں۔''

''آپا۔ہماری جیب آج کل سرد ہے۔''

''ابھی گرم کیے دیتی ہوں۔لیکن یہ تبھی گرم رہ سکے گی جب امین جیسے قدردان آتے رہیں ورنہ اپنی جیب کو سرد رکھنے کی عادت ڈال لو۔''

دولت دولت کو کھینچتی ہے۔امین نے دیکھا کہ سمندر نگر میں روئی بوئی جاتی ہے تو اس کے دماغ میں کپڑے کا کارخانہ لگانے کا خیال آیا۔اس نے احمد خان کو بلایا اور سمندر نگر میں کارخانے کے لیے اچھی زمین تلاش کرنے کے کام پر لگا دیا۔کچھ دنوں بعد احمد خاں واپس آیا۔

''کیا ہوا احمد خاں۔''

''صاحب آپ کے کہنے کے مطابق ۲۰ کنال زمین کا سودا ہو گیا ہے۔آپ کاغذات دیکھ کر اسے خرید سکتے ہیں۔''

"ہاں۔ مجھے بھی اس کاروبار میں بڑا منافع سمجھ میں آرہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اپنا سارا روپیہ اسی میں لگا دوں جس سے کہ یہ ملک کا سب سے بڑا کارخانہ بن جائے اور بہت منافع ہو۔"

"جی۔"

(۱۳)

کارخانے کی ابتدا کے دن اس نے ایک بڑی تقریب رکھی اور سمندر نگر کے لوگوں کو بھی اس میں مدعو کیا۔ امین نے اپنی تقریر میں کہا۔

''بھائیوں۔ میں نے آپ لوگوں کی مالی حالت کو مضبوط کرنے کی غرض سے یہ کارخانہ کھولا ہے۔ یہاں مزدور مالک سب برابر ہوں گے۔ مل کر کام کریں گے اور ملک کے اس سب سے بڑے کارخانے کو بلندی پر پہنچائیں گے۔''

امین کی اس عیاری نے لوگوں کا من جیت لیا۔ لوگ زبردست محنت سے اس کے کارخانے کو بلندی پر لے جانے لگے۔ لیکن جلد ہی اس کی گندی فطرت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ مزدور جب تک اس کی عیاری مکاری سمجھتے، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا۔

(۱۴)

''امی حضور۔ایک دوست نے خط لکھا ہے کہ تم سمندر نگر چلے آؤ تو میں تمہیں نوکری دلوادوں گا۔''

''میرے لال کیا تو اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر کوسوں دور نوکری کرنے جائے گا۔''

''ایک جگہ بیٹھنے، چھوٹا موٹا کام کرنے سے ہماری مفلسی دور نہیں ہوگی امی۔ بڑی جگہوں پر بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ دوست نے لکھا ہے کہ ملک کا سب سے بڑا کپڑے کا کارخانہ ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بڑے امکانات ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔ میری دعائیں ترے ساتھ ہیں۔ کب جانا ہے۔''

''کل۔امی آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کی رحمت اور آپ کی دعائیں مرے ساتھ ہیں۔ جلد ہی میں آپ کو وہاں بلالوں گا۔''

دوسرے دن رقیہ نے بھاری من سے اپنے بیٹے کو وداع کیا۔ بہت دیر تک دروازے پر کھڑی ہو کر اس کو دیکھتی رہی۔ اور وہ جب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔ جب وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔ تنہائی اور افلاس سے لڑتے لڑتے وہ نہ جانے کب خود کو ختم کر لیتی اگر اقبال علی اسے اپنے بچپن میں ندی کے کنارے ریت پر بے ہوش پڑا نہ ملتا۔ معصوم بچہ۔ لگتا تھا کہ کسی رئیس گھرانے کا ہے۔ لیکن اب تو قدرت نے اسے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ رقیہ کو جینے کا سہارا مل گیا تھا اور اسی کے بھروسے اس نے جوانی سے بڑھاپے تک کے دن افلاس سے جدوجہد میں کاٹ دیے۔

(۱۵)

دو دن کے سفر کے بعد اس کی ریل گاڑی سمندر نگر کے اسٹیشن پر پہنچی۔ وہاں اس کا دوست شوکت موجود تھا۔

''کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔ لیکن تم کچھ دبلے پتلے دکھائی دے رہے ہو۔''

''کچھ نہیں یار۔ یہ سب افلاس اور بے روزگاری کی نشانی ہے۔''

''فکر نہ کرو.... مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں یہاں ضرور نوکری مل جائے گی۔ لیکن مالک تھوڑا ٹیڑھا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانا اور اس کے سامنے خود کو کمتر سمجھنا۔ کسی کے بہکاوے میں آ کر کوئی ایسی حرکت، کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ نوکری پر بن آئے۔''

''مجھے کسی سے کیا مطلب۔ مالک کا حکم بجانا، اپنا کام ایمانداری سے کرنا، یہی میری زندگی کا اصول ہے۔''

امین فائلوں میں غرق تھا کہ جمال کمرے میں داخل ہوا۔

''کہو جمال کیسے آئے۔''

''حضور آپ نے طوائف رانی جیسی کتنی ہی جوانیوں کو بڑھاپے میں بدل دیا لیکن خود اب تک جوان ہیں۔ اس لیے آپ کے لیے ایک بالکل نئی کلی منگائی گئی ہے۔ وہ نازنین.....مہ جبیں.....''

''اتنا قصیدہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''حضور وہ صیاد شاہ جو آپ کا پاسنگ بھی نہیں، اس کلی کا رس چوسنے کو اکثر چکر لگاتا ہے لیکن ابھی تک منی بائی نے گلنار کو سیپ میں بند موتی کی طرح محفوظ رکھا ہے کہ حضور پہلی بار

اس کی گرہ کھول دیں تو آگے کا رستہ طے ہو۔"

"اس بھکاری صیاد شاہ کی یہ مجال۔ اس کی اوقات ہی میرے سامنے کیا ہے۔ اس کے جیسے سینکڑوں میرے ملازم ہیں۔ میرے جوتے کے نیچے ہیں۔ تم جاؤ اور دیکھو کہ وہ گلنار کو حاصل نہ کرنے پائے۔ یہ کچھ روپے بھی لیتے جاؤ۔ منی بائی سے کہنا روپیوں کی پرواہ نہ کرے۔"

"جی بہت اچھا۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔"

جمال باہر آیا اور اقبال امین کے کمرے میں داخل ہوا۔ دفتر کی سجاوٹ دیکھ کر اقبال حیرت زدہ رہ گیا۔ قیمتی قالین، جھاڑ فانوس، قیمتی تصویریں، قیمتی فرنیچر۔ اس نے اس سے قبل اتنا شاندار کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ امین اس کی درخواست دیکھ رہا تھا۔

"تو تمہارا نام اقبال ہے۔ بی. اے. پاس ہو۔"

"جی ہاں۔"

"ٹائپ بھی کرنا جانتے ہو۔"

"جی ہاں۔"

"اس سے پہلے کہیں کام کیا ہے۔"

"جی نہیں۔"

"دیکھو ڈیڑھ سو روپے کی نوکری تمہیں مل سکتی ہے۔"

"میں تیار ہوں۔"

"ہماری کمپنی کا اصول ایمانداری سے کام کرنا ہے۔ تم جانتے ہو۔"

"جی ہاں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

وہ باہر آیا۔

"کام مل گیا۔"

"ہاں۔"

''مبارک ہو یار۔ اب اپنی ماں کو یہیں بلا لو۔''

''ہاں یار۔ آج ہی خط لکھ دیتا ہوں۔''

خط ملتے ہی رقیہ دوسرے دن سمندر نگر کے لیے روانہ ہوگئی۔ وہاں پہنچنے پر اقبال نے اسے اسٹیشن سے لیا اور گھر آ گیا، جو اسے کمپنی کی اور سے رہنے کو ملا تھا۔

''یہ ہمارا گھر ہے امی۔ اب ہم سکھ سے رہیں گے۔''

''بیٹا مجھے سکھ تو تب ملے گا جب اس گھر میں ایک چاند سی بہو آئے گی۔''

''ابھی تو امی اپنی تنخواہ ڈیڑھ سو روپئے ہے۔ اتنے میں شادی.....''

''بیٹا جب تمہاری شادی ہوگی تو بہو بھی اپنی قسمت سے روزی لائے گی۔''

(۱۶)

''شاہ آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔''

''کیا کروں منی بائی اب کام بہت رہتا ہے۔ اچھا اس لڑکی کو بلاؤ۔''

اس نے گلنار کو آواز دی۔ گلنار چھم چھم کرتی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پاندان تھا، اس نے امین کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آداب''

گلنار حسن کی بجلی تھی۔ امین نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''واقعی تم گلنار ہو۔''

اس نے پانچ ہزار روپئے گلنار کے ہاتھ میں رکھے اور اس کو اپنے بازو میں کھینچنے ہی والا تھا کہ کارخانے کا منشی دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا بات ہے۔ یہاں کیوں آ گئے۔''

''حضور بات ہی کچھ ایسی ہے۔ جس پارٹی نے آپ سے پانچ لاکھ کا کپڑا لینے کی بات کی تھی وہ اچانک آ گئی ہے۔ پیسے بھی ساتھ لائی ہے۔ اسے صبح ہی جانا ہے۔ اس لیے سودا ابھی کرنا ہے۔ صبح چار بجے ہی اس کی ریل گاڑی ہے۔ اس لیے آج کی رات میں ہی سودا پکا کرنا بڑی مجبوری ہے ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''اوہو..... یہ کاروبار بھی نا....''

حالانکہ امین وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ منشی کو واپس کر دے۔ لیکن تجارتی دماغ نے عیاش دل پر قابو پایا۔ دماغ نے کہا کہ گلنار تو اپنی ہے ہی۔ آج نہیں تو کل۔ لیکن پارٹی ایک بار چلی گئی تو اس نقصان کے ساتھ ساتھ آئندہ کے کاروبار سے

ہونے والے فائدے پر بھی روک لگ جائے گی۔ اس لیے دانش مندی اسی میں ہے کہ آج چلا جائے۔ گلنار تو اپنے ہاتھ کا مال ہے ہی۔

''منشی کل کا کیا پروگرام ہے۔''

''حضور کل تو آپ کو شہر سے باہر جانا ہے۔''

''اوہ۔ اچھا واپسی کب ہوگی۔''

''جی پورن ماشی کے دن۔''

''تو ٹھیک ہے منی بائی۔ ہم پورن ماشی کے دن آئیں گے۔ تب تک گلنار تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔''

(۱۷)

''امی میں آ گیا۔''

''بیٹے میں چائے لاتی ہوں۔''

اقبال چائے پینے لگا تو رقیہ نے بات چھیڑی۔

''آج صبح ہی اپنی بستی سے آدم آیا تھا۔''

''کون آدم۔''

''بیٹے وہ تمہارے لیے رشتہ لایا تھا۔''

''امی۔ آپ تو میری شادی کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔''

''بیٹا میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے اور تمہارا سحرا دیکھنے کی تمنا دل میں ہی رہ جائے۔''

''امی آپ ایسی باتیں مت کیجیے۔ آپ سو سال جئیں۔ دیکھئے ابھی نئی نئی نوکری ہے۔ ہمارے گھر سے ابھی ابھی مفلسی دور ہوئی ہے۔ تو کم سے کم ایک سال کا وقت تو چاہیے تا کہ آنے والے مستقبل کے لیے تیاری کی جائے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ بات تو تیری بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ جو تیرے رشتے آتے رہتے ہیں ان کا میں کیا کروں۔''

''امی جان۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ہم شادی کے متعلق کم از کم ایک سال کے بعد سوچیں گے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔''

(۱۸)

''محمود کیا بات ہے۔''

اقبال نے مزدوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو جمع ہوتے دیکھا تو پوچھا۔

''ارے یار یہ ہے نا اپنا امین سیٹھ۔ یہ اس سال بھی بونس نہیں دے گا۔ اس کا خاذن کہہ رہا تھا کہ اس سال بھی کمپنی کو نقصان ہوا ہے۔ جھوٹا، مکار سالہ۔''

''تو مالک سے بات کریں۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔ وہ بوڑھا بلہ تو شہر سے باہر ہے۔ یہ تیسرا سال ہے جب ہمارا بونس ہڑپ کیا گیا ہے۔ اب تو صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔''

''تو......''

''آج ایک میٹنگ بلاتے ہیں۔ وہیں آگے کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔''

(۱۹)

''کیا بات ہے بیٹا۔ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔''

''سوچتا ہوں امی کہ غریب کی قسمت میں سکھ شانتی تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے نئی نئی مصیبتیں اس کا تعقب کرتی رہتی ہیں۔''

''کیا ہوا۔''

''ہمارا مالک ۳ سال سے بونس نہیں دے رہا ہے۔ مزدوروں نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے کمر کس لی ہے۔ آج رات کو اس سلسلے میں میٹنگ ہے۔ مجھے وہاں جانا پڑے گا۔''

''نہیں تم وہاں مت جاؤ۔ ٹھیک ٹھاک زندگی گزر رہی ہے۔ تمہیں اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا امی۔ آخر مجھے اپنے مزدور ساتھیوں کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ اور ان کا مطالبہ بھی ناجائز نہیں ہے۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ کمپنی بہت منافع میں ہے ورنہ دن بہ دن نئے نئے ملازم کیوں بھرتی کیے جا رہے ہیں اور مشینیں کیوں بڑھائی جا رہی ہیں۔ زمینیں کیوں خریدی جا رہی ہیں۔ میرا ضمیر بھی نہیں مانتا کہ میں اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دوں۔''

''ضمیر کی آواز کو دبانا نہیں چاہیے بیٹا۔ تم جو مناسب سمجھو کرو۔''

(۲۰)

''دوستوں۔ ہم دن رات محنت کر کے اپنے سیٹھ کی تجوریاں بھر رہے ہیں لیکن وہ ہم سے لگاتار تین سال سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کمپنی منافع میں چل رہی ہے۔ پھر بھی دو سال ہم نے ضبط کر کے سیٹھ کے جھوٹ کو نظر انداز کیا لیکن ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اگر ہم اب بھی اپنے حق کے لیے ایک نہ ہوئے اور مطالبہ نہیں کیا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ بونس نام کی چیز اس کارخانے سے ختم کر دی جائے گی۔''

''دوستو۔ بونس ہمارا حق ہے۔ ہمارے خون پسینے کی کمائی ہے۔ کل سے ہڑتال شروع ہوگی اور دو دن تک چلے گی تاکہ مالک کو ہمارے مسئلے کی سنجیدگی سے واقفیت ہو۔ اور وہ اس پر غور کر کے ہمارے حق میں فیصلہ کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو دو دن بعد آگے کا پروگرام بنایا جائے گا۔''

یہ کل چالیس مزدوروں کی میٹنگ تھی جس میں محمود نے تقریر کی۔ محمود کو مزدوروں نے اپنا قائد چن لیا۔ حالانکہ کارخانے میں پندرہ سو سے زائد ملازم کام کرتے تھے۔ لیکن سب کے مسئلے ایک ہونے کے سبب ان کے ایک ہونے کا پورا امکان تھا۔

(۲۱)

''اقبال جب گھر آیا تو ماں کو بیمار پایا۔''

''چاچی کیا ہوا امی کو۔''

''کچھ نہیں بیٹا۔ پتہ نہیں کیوں بے ہوش ہو گئیں۔ تم جا کر ذرا ڈاکٹر کو لے آؤ۔''

''جی۔''

وہ بھاگتا ہوا گیا اور ڈاکٹر کو لے آیا۔

''شاید کمزوری سے بے ہوش ہو گئیں ہیں۔ میں انجکشن دے دیتا ہوں۔ کل آپ انہیں ضرور اسپتال لے جا کر ان کا اکسرے کروالیں۔''

''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔''

''یہ تو اکسرے دیکھنے کے بعد ہی بتایا جا سکے گا۔''

انجکشن کے کچھ دیر بعد رقیہ ہوش میں آ گئی۔

''امی۔ خدا کا شکر ہے آپ ہوش میں آ گئیں۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''

''زندگی، موت تو خدا کے ہاتھ ہے بیٹا۔ جب بلاوا آ جائے گا۔ جانا ہی پڑے گا۔''

''ابھی نہیں امی۔ ابھی مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کے بغیر میں بالکل تنہا ہو جاؤں گا۔''

رات کو دیر تک جاگنے کے سبب وہ صبح دیر سے اٹھا۔ اٹھتے ہی اسے اسپتال کا خیال آیا۔ وہ تانگہ لینے باہر بھاگا۔ دوڑ، دھوپ میں وہ ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

''اندھے ہو کیا۔''

''معاف کرنا بہن۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکا۔ میں ذرا پریشان ہوں۔''

''بہن..... تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں۔ میں طوائف ہوں۔''

''تو کیا ہوا۔ طوائف بھی تو انسان ہوتی ہے۔ کسی کی بہن بیٹی ہوتی ہے۔''

''تو یہ جان کر بھی کہ میں طوائف ہوں تمہیں مجھ سے کراہیت محسوس نہیں ہوتی۔''

''بالکل نہیں۔ جب میں نے تمہیں بہن کہہ دیا تو واقعی تم میری بہن ہو۔''

''تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے ہو۔''

''میرا نام اقبال ہے اور میں کھولی والی گلی میں رہتا ہوں۔''

''میں تم سے ملنے آؤں گی۔ آسکتی ہوں نا۔''

''بالکل بلا کسی ڈر خوف کے۔''

''میرا نام گلنار ہے اور میرا ٹھکانہ پورے شہر کو معلوم ہے۔ میں شریف گلی میں رہتی ہوں۔''

''بہن میں تم سے ملنے آتا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہاں لوگ بھائی بہن کے رشتے پر شک کریں گے۔''

''میں جانتی ہوں بھیا۔ لیکن میں تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔''

''بالکل آنا...... ارے معاف کرنا۔ ماں بیمار ہے، مجھے سواری لینی ہے۔ میں چلتا ہوں۔''

''خدا حافظ بھیا۔''

(۲۲)

ڈاکٹر اکبر کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی امی کو ہرنیا ہے۔اس کا آپریشن جتنی جلد ہو جائے ،اچھا ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب آپریشن بڑا تو نہیں۔''

''بالکل نہیں۔بہت چھوٹا اور آسان آپریشن ہے۔''

''ٹھیک ہے میں دو دن کے بعد پھر امی کو اسپتال لاکر بھرتی کر دیتا ہوں۔''

''اب کیسا لگ رہا ہے امی۔''

''طبیعت تو اچھی ہے بیٹا۔''

''خدا کا شکر ہے۔امی پرسوں آپ کو پھر اسپتال لاکر بھرتی کرانا ہے۔ایک چھوٹا سا معمولی آپریشن ہے۔اس کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

رقیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا۔آپریشن پھر بھی آپریشن ہے۔''

(۲۳)

گلنار کھولی گلی میں اقبال کے گھر میں داخل ہوئی۔

''اقبال بھائی کا گھر یہی ہے۔''

''ہاں یہی ہے۔تم کون ہو بیٹی۔''

''جی میں اقبال بھائی کی منہ بولی بہن ہوں۔آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہوں بیٹی۔اقبال کہہ رہا تھا کہ پرسوں پھر اسپتال جانا ہے۔چھوٹا آپریشن ہے۔میں اس فکر میں ہوں کہ میرے اسپتال جانے کے بعد اس کے کھانے پینے کا کیا ہوگا۔''

''اقبال بھائی کہاں ہیں۔''

''پاس میں اپنے دوست کے یہاں گیا ہے۔'' اتنے میں اقبال آ گیا۔

''اچھا گلنار بہن کیسی ہو۔''

''اچھی ہوں بھیا۔ماں کو دیکھنے آئی تھی۔اب میں چلتی ہوں۔پھر آؤں گی۔''

''ایسا کیا کہ ابھی آئی، ابھی چلی۔کچھ کھا پی لو۔ذرا دم لے لو۔''

''نہیں امی اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''جیسی تمہاری مرضی بیٹی۔اقبال جاؤ اپنی بہن کو چھوڑ آؤ۔''

وہ دونوں شریف گلی کی اور چل پڑے۔

''امی کہہ رہی تھیں کہ وہ دو دن اسپتال میں رہیں گی تو تمہارے کھانے پینے کا کیا ہوگا۔اگر تم مناسب سمجھو تو ان دنوں میں گھر آ جاؤں، تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھنے کے لیے۔''

مناسب کی کیا بات ہے بہن۔تمہارا گھر ہے جب آؤ جتنے دن رہو۔یہاں کوئی بات

نہیں ہے لیکن اس سے تمہارے گھر والوں کو......"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"پھر بھی۔"

"دیکھو میں تمہاری بڑی بہن ہوں نا۔ بڑوں کا حکم نہیں ٹالا کرتے۔"

اقبال امی کو لے کر اسپتال گیا۔ گلنار بھی ساتھ تھی۔ بھرتی میں دیر تھی۔ اقبال نے کہا۔

"کیا یہ ممکن ہے بہن کہ تم اس گلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کے گھر آجاؤ۔"

"اس بارے میں پھر بات کریں گے بھیا، پہلے امی کو ٹھیک ہو جانے دو۔"

امی کو اسپتال میں داخل کر کے گلنار اقبال کے گھر آ گئی۔

دوسرے دن صبح اقبال نے نہا کر کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

"بہن وہ میز پر میرا لاکٹ ہوگا۔ میں نے نہاتے وقت اتار دیا تھا۔ ذرا اسے لے آؤ۔"

گلنار نے لاکٹ کو اٹھایا تو اسے وہ مانوس لگا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ تو میرا لاکٹ ہے۔ یہاں کیسے......ارے میرا لاکٹ تو میرے پاس ہے۔ بالکل ہو بہو میرے جیسا لاکٹ۔"

"بھیا یہ لاکٹ تم نے کہاں سے خریدا۔"

"میں نے اسے نہیں خریدا بلکہ یہ تو بچپن سے ہی مرے گلے میں ہے۔"

"کمال ہے۔ منی بائی نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں اسے ریل کے حادثے کے بعد ملی تھی تو اس وقت یہ لاکٹ میرے گلے میں تھا۔ شاید یہ میرے ماں باپ کی نشانی ہے۔"

"ارے یہ تو میرے جیسا ہو بہو لاکٹ ہے۔ مجھے امی سے پوچھنا پڑے گا کہ یہ لاکٹ اس نے کہاں سے خریدا ہے۔ شاید تمہارے ماں باپ کا پتہ لگ جائے۔ چلو اسپتال چلتے ہیں۔"

"امی جیسا لاکٹ میرے پاس بچپن سے ہے، اسی طرح کا لاکٹ بہن کے پاس بھی بچپن سے ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ میرا لاکٹ آپ نے کہاں سے خریدا تھا۔ شاید بہن کے

ماں باپ کا کچھ پتہ لگ جائے کیونکہ اس کو پالنے والی نے بتایا کہ یہ اس کو ریل حادثے والے دن ندی کے کنارے ملی تھی اور اس کے گلے میں یہ لاکٹ تھا۔''

''بیٹا۔ میں نے بھی تو تمہیں ریل کے حادثے والے دن ندی کے کنارے ریت پر ہی پایا تھا۔''

''کیا۔اس کا مطلب تم میری اصلی ماں نہیں ہو۔''

''نہیں بیٹا۔تو مجھ بے کس لاچار کو خدا کا دیا ہوا وہ عطیہ تھا کہ ترے ملنے کے بعد میری زندگی میں جینے کی تمنا جاگی۔ ورنہ اس بھری دنیا کی تنہائی میں تو میں کب کی مر چکی ہوتی۔'' اس کے بعد رقیہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ماں باپ شاید ہمیں لے کر ریل گاڑی سے کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں یہ حادثہ پیش آیا۔شاید ہمارے ماں، باپ، کوئی بھائی، بہن ہو اور وہ زندہ ہوں۔ یا نہ ہوں۔''

''خدا بڑا کریم ہے بھیا اس نے اتنے سالوں بعد مجھے میرے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملا دیا ورنہ نہ جانے میرا کیا ہوتا۔''

رقیہ اور اقبال نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

(۲۴)

اقبال پہلی بار شریف گلی میں داخل ہو رہا تھا۔گلنار اس کے ساتھ تھی۔

''اری بیٹی۔تو تو کچھ دن بعد آنے والی تھی.....اور یہ کون ہے؟''

''یہ میرا چھوٹا بھائی اقبال ہے آپا جی جو بچپن میں بچھڑ گیا تھا۔ہم دونوں ہی ریل کے حادثے میں جدا ہو گئے تھے۔ہمارے گلے میں ایک ہی قسم کا لاکٹ ہے۔یہ دیکھئے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا بیٹی۔''

''آپا جی۔میرا بھائی مجھے اس دنیا سے دور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''

''بیٹی۔جب ایک بار کوئی لڑکی یہاں آ جاتی ہے تو اس کے گھر والے بھی اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے جو زمانے سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ورنہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو گھر والوں کو لے جاتے اور پھر ذلت کے ساتھ لڑکیوں کو ہمیشہ کے لیے یہاں آتے دیکھا ہے۔''

''آپ یقین مانئے آپا جی۔چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے چاہے مجھے یہ شہر چھوڑ کر جانا ہی کیوں نہ پڑے، کتنی ہی مصیبتیں آئیں لیکن میں اپنی بہن کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔اس کو ایک شرافت کی زندگی دوں گا۔اس کی شریف گھر میں شادی کر کے اپنا فرض ادا کروں گا۔''

''مجھے تمہاری باتوں میں سچائی محسوس ہوتی ہے۔جاؤ گلنار اپنے بھائی کے ساتھ جاؤ۔تم آزاد ہو۔''

''آپ بہت نیک عورت ہیں آپا۔''

''بیٹی ہم عورتیں جن مجبوریوں میں اس پیشے میں قدم رکھتی ہیں اور زبردستی دھکیل دی جاتی ہیں۔وہ تم بخوبی جانتی ہو۔تمہیں یہاں سے آزاد کر کے میں سمجھوں گی کہ میں نے کوئی بڑا

نیک کام کیا ہے۔ جاؤ اب جلدی یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنے کپڑے، سامان وغیرہ سمیٹ لو۔ جلدی کرو۔"

"خدا حافظ آپا جی۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے اور عزت کی زندگی عطا فرمائے۔"

(۲۵)

پورن ماشی کی رات آ گئی۔ امین نے منی بائی کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''لاؤ منی بائی۔ میری امانت مرے حوالے کرو۔''

''آپ کے پیسے میں نے پہلے ہی میز پر رکھ دیے تھے امین صاحب۔ وہ رکھے ہیں۔ گلنار یہاں سے چلی گئی۔''

''اچھا...... اور تم نے اسے جانے دیا۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ کسی رئیس زادے نے تمہیں زیادہ پیسوں میں خرید لیا اور تم نے بے ایمانی کی۔''

''نہیں امین صاحب۔ کچھ جذبات، کچھ نیکیاں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ ساری دنیا کی دولت مل کر بھی اس کو نہیں خرید سکتی۔ گلنار کا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ اس کے گلے میں بھی وہی لاکٹ تھا جو ریل حادثے کے دوران مجھے ملی گلنار کے گلے میں تھا۔''

''ریل حادثہ.....'' امین کے دماغ پر ایک جھٹکا لگا۔ اور وہ منی بائی سے بنا کچھ کہے بغیر روپے اٹھائے انتشار کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔

(۲۶)

''امی آپ اچھی ہو کر گھر واپس آ گئیں۔ بہن بھی آ گئی۔اب میں کام پر جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔خدا کا شکر ہے کہ تمہیں تمہاری بہن مل گئی۔''

''اور مجھے ماں اور بھائی۔'' گلنار نے رقیہ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

اقبال کے گھر کے مسئلوں میں مصروف ہو جانے کے سبب محمود اکیلا پڑ گیا۔ اور چالیس کے علاوہ دوسرے لوگ اس سے نہ جڑ سکے۔ اگر یہ مہم ناکام ہو جاتی تو محمود کا اور ان چالیس مزدوروں کا کام سے نکالا جانا طے تھا۔ اقبال اب اپنے ضمیر کو دبا نہیں سکا۔ محمود تقریر کر رہا تھا کہ اقبال نے اسے پیچھے ہٹا کر خود بولنا شروع کیا۔

''بزدلوں۔ کیا زندگی بھر یوں ہی مر مر کے جیتے رہو گے۔ کمر توڑ محنت کرنے کے بعد بھی آدھا پیٹ کھاؤ گے اور اپنے بال بچوں کو بھوکا رکھو گے۔ ان کی شادی بیاہ کے لیے لوگوں سے بھیک مانگتے پھرو گے۔ کم ظرفوں، اکتالیس مزدور تمہارے حق کے لیے، اپنے حق کے لیے سرمایہ داری سے لڑ رہے ہیں اور تم ان کا ساتھ دینے کی بجائے مالک کے پٹھو بنے ہوئے ہو۔ اس طرح کب تک زندہ رہ سکو گے اور مسائل سے لڑ سکو گے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تمہیں اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو بھی اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ان سرمایہ داروں کی عیاشی میں گروی رکھنا پڑے گا۔ یاد رکھو۔''

اقبال پڑھا لکھا تھا اور اب تک اس مہم سے دور تھا۔ لیکن اس کی تقریر میں اتنا جوش تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے مزدور اکٹھا ہو گئے اور آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ ایک مزدور نے جذبات میں چیخ کر کہا۔

''آپ پڑھے لکھے ہیں۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ

ہیں۔"

"بالکل میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مرتے دم تک۔"

"تو ہم آپ کو اپنا لیڈر مانتے ہیں۔ کیوں بھائیوں۔"

چاروں اور سے 'ہمیں منظور ہے۔ ہمیں منظور ہے' کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوئیں۔

"بھائیوں! میں آپ کا لیڈر نہیں۔ آپ کا بھائی ہوں۔ ایک مزدور ہوں اور آپ سے التجا کرتا ہوں کہ محمود کو ہی لیڈر مانیں کیونکہ سب سے پہلے اسی نے ہماری مظلومیت کے خلاف نارۂ احتجاج بلند کیا تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ محمود کو سارے لوگ لیڈر تسلیم کریں اور آپسی مشورے سے جو بھی پروگرام آگے بنے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

"ہمیں منظور ہے۔"

(۲۷)

ہڑتال شروع ہوگئی۔ امین کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے منشی کو بلایا۔

''یہ سب کیا ہے۔''

''حضور مزدور بونس کی مانگ کر رہے ہیں۔''

''اوفو..... تو ان کے لیڈر کو خرید کر ہڑتال ختم کرادو۔''

''ابھی ایسا ممکن نہیں ہے حضور۔ میں سوچتا ہوں پہلے آپ معاملے کو سمجھ لیں۔ اس کے لیڈر کے تیور بھانپ لیں۔''

''اچھا۔ کون ہے ان کا لیڈر۔''

''لیڈر تو ان کا محمود ہے لیکن وہ انپڑھ ہے۔ اس کے پیچھے اقبال کا دماغ کام کر رہا ہے جو کہ بی. اے. پاس ہے۔''

''تو پھر بات کس سے کرنی چاہیے۔''

''میرے خیال سے اقبال کو ہی بلا کر بات کرنی چاہیے۔''

''دیکھو اقبال۔ میں سمجھتا ہوں تم میرے آدمی ہو۔ میں نے تمہاری قابلیت دیکھ کر تمہیں نوکری دی۔ لیکن تم میرے خلاف ہو گئے۔ تمہیں ان کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔ تمہاری کوئی ذاتی پریشانی ہو تو تم مجھے بتاؤ۔''

''پریشانی تو میری وہی ہے سر جو سارے مزدوروں کی پریشانی ہے۔ بونس نہیں۔ اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں۔''

''تو تنخواہ لے لو۔ کون تمہاری تنخواہ دباتا ہے۔ ابھی تنخواہ لو اور کام پر آجاؤ۔''

''نہیں سر۔ تنخواہ نہیں دبائی جا رہی ہے بلکہ بونس کی شکل میں ہمارا حق دبایا جا رہا

ہے۔ اب تو بونس اور تنخواہ ایک ساتھ ہی لیں گے۔"

"تم جا سکتے ہو۔"

اقبال نے باہر جا کر مزدوروں کو اندر کا واقعہ کہہ سنایا۔ اقبال کی ایمانداری سے مزدوروں میں مزید جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے انقلاب زندہ باد کا ایسا زور کا نعرہ لگایا کہ امین کے دفتر کے در و دیوار ہل گئے۔

"میں اس کو ختم کرا دوں گا۔"

"کس کو سرکار۔"

"اسی کتے اقبال کو جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتا ہے اور......."

"سرکار عقل سے کام لیجیے۔ ایک اقبال مرے گا تو یہ سارے ۱۵۰۰ سے زیادہ مزدور اس کی جگہ لے لیں گے۔ اس کو مارنا ہے تو اس کی ضرورت سے مارئے۔ یہ خود بہ خود مر جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سرکار۔ اس کی ایک جوان بہن ہے جس کی شادی کے لیے یقیناً اسے اچھے خاصے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ سبھی مزدوروں کی طرح اس کے گھر میں بھی آج کل تنگ دستی چل رہی ہے۔ اس متعلق اس سے بات کی جائے تو پوری امید ہے کہ وہ پگھل جائے گا کیونکہ اس قسم کی ضرورت کے آگے بڑے بڑے پتھر دل پگھل جاتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں۔"

(۲۸)

اقبال اپنے گھر میں داخل ہوا۔ گلناراس کی منتظر تھی۔

''بھائی۔ بستی میں شور ہے کہ کارخانہ بند ہے اور مزدوروں نے ہڑتال کی ہے۔''

''ہاں بہن۔ ہم لوگ اپنے حق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ خود اپنا پیٹ جلا رہے ہیں اور مالک کا صرف مالی نقصان ہو رہا ہے۔ خیر ہم حق پر ہیں، جیت ہماری ہوگی۔ کھانے میں کیا ہے؟''

''بھیا۔ کچھ دنوں میں راشن کی ضرورت پڑے گی۔''

''کوئی بات نہیں بہن۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

اقبال کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''منشی جی آپ! اس وقت۔''

''ہاں۔ آپ کو مالک نے اس وقت حویلی پر بلایا ہے۔ بہت خاص کام ہے۔''

''اس وقت..... اچھا چلو۔''

وہ امین کی بڑی حویلی میں داخل ہوا۔

''آؤ، اقبال۔ بھئی تم نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔''

''ایک آپ ہی تو اپنے ہیں سر۔ آپ ہماری بات مان لیں۔ ہمارا حق دے دیں۔ ہم کمپنی کو پھر سے اپنی محنت سے عروج پر لے جائیں گے اور آپ کا اس وقت کمپنی بند ہونے سے جو نقصان ہوا ہے، وہ بھی ہم اپنی بھرپور محنت سے پورا کر دیں گے۔''

''وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ تم ابھی نئے آئے ہو، محنتی ہو۔ تمہیں اس سے کیا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے گھر میں آج کل تنگ دستی ہے اور تمہاری بہن کی شادی کے لیے بھی

روپئے چاہئیں۔ دیکھو تم تو ابھی نئے آئے ہو تین سال کے بونس سے تمہارا کوئی مطلب تو ہے نہیں۔ اور پھر تم تو مزدور بھی نہیں ہو، پڑھے لکھے کلرک ہو جو آگے بہت ترقی کر سکتا ہے۔''

''اسی طرح کی باتوں سے سرمایہ داری آج کل حاوی ہے جناب۔ بیدار ذہنوں کو خرید کر، ان کو اپنی طرح آسائشیں دے کر، ان کو اپنے گروہ میں شامل کر کے مظلوموں کو اکیلا کر دیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے سر کہ میں کسی بھی حال میں اپنے مزدور بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔''

امین اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا اور اقبال وہاں سے واپس آ گیا۔

(۲۹)

منشی بھاگتا ہوا امین کی حویلی میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے۔اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''حضور سرکاری افسر آیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے سرکار تک بھی ہڑتال والی بات پہنچ گئی۔''

''کوئی بات نہیں حضور، میں تو آپ سے یہ کہنے کے لیے پہلے ہی دوڑتا ہوا آیا ہوں کہ آپ کچھ روپئے نکال لیں۔ جتنا زیادہ روپیوں کا وزن ہوگا یہ افسر اتنی ہی ہلکی رپورٹ آپ کے خلاف بنائے گا۔یا پھر ادھر ادھر کر کے معاملے کو پوری طرح رفع دفع ہی کر دے گا۔''

''ہوں۔''

سرکاری افسر اندر داخل ہوا۔

''آیئے حضور۔تشریف رکھئے۔''

''امین صاحب۔آپ کی کمپنی میں شاید کچھ ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔مزدوروں نے ہڑتال کی ہے۔مجھے سارے واقعے کی رپورٹ سرکار کو بھیجنی ہے۔اس لیے.......''

افسر اپنے جملے پورے بھی نہ کر پایا تھا کہ امین نے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔افسر انہیں کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔

''دراصل جناب یہ مزدور بڑے مفت خور ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے کارخانہ گھاٹے میں ہے۔اگر ایک کو نکالو تو سارے ایک ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ظلم مجھ پر ہو رہا ہے۔ کارخانہ بند ہے۔نقصان پر نقصان۔ بتایئے میں کہاں جاؤں اپنی فریاد لے کر۔ پولیس،کورٹ میں جاؤں تو انہیں تکلیف ہوگی۔ان کی تکلیف دیکھ کر مجھے تکلیف ہوگی۔آخر ہیں تو یہ سب

میرے ہی پالے ہوئے۔آپ سمجھ گئے نا۔" امین نے نوٹوں کی گڈی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔افسر نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ درست فرماتے ہیں امین صاحب۔ یہ مزدور قوم ہوتی ہی کام چور ہے۔ جب مصیبت میں ہوتے ہیں تو ہاتھ پیر جوڑ کر نوکری مانگتے ہیں اور جب پیٹ کچھ بھرنے لگتا ہے تو اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔اچھا میں چلتا ہوں۔آپ فکر نہ کریں۔میری رپورٹ آپ ہی کی حمایت میں جائے گی۔

(۳۰)

''دوستو! ہم نے ہڑتال کر کے دیکھ لی۔ لیکن مالک نے کسی بھی طرح ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے ہمیں بھوک ہڑتال کے لیے مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ کل سے بھوک ہڑتال شروع ہوگی۔''

سرکاری افسر نے امین سے کہا۔

''امین صاحب! مزدوروں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔ شہر میں چاروں طرف اس کا چرچا ہے۔ حکومت کو خوف ہے کہ بھوک ہڑتال کے دوران فساد نہ پھیل جائے۔ قانونی نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔ آپ کو کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ ہڑتال ختم ہو۔ کیونکہ عام ہمدردیاں بھی مزدوروں کے ساتھ ہوتی جا رہی ہیں۔ سیاسی جماعتیں بھی اپنا ووٹ بڑھانے کے لیےان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ شہر بھر کے امیروں کے خیالات بھی آپ کے خلاف ہیں کہ آپ مسئلے کو سہی طرح سلجھا نہیں پا رہے ہیں اور اس طرح ان کے ملازمین کو بھی بہک جانے کا خطرہ ہے۔ میں کیا کروں۔''

امین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ منشی نے اشارہ کیا اور سمجھایا۔

امین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جناب آپ کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ حکومت کے کان بھرے۔ اب آپ اس مسئلے کو اور اس کے متعلق شہر کے لوگوں کے خیالات کو اتنا سمجھتے ہیں تو اس کا حل بھی اگر آپ کی نظر میں کوئی ہو تو تجویز کریں۔ پیسوں کی فکر نہ کریں۔''

''کام مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کافی رقم خرچ ہوگی تقریباً ۲۰ رہزار روپئے۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوئی ایسا راستہ سوچتا ہوں کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور

لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

(۳۱)

اقبال بھوک ہڑتال پر بیٹھ گیا۔ محمود باہر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی طرح تین دن بیت گئے۔ مسئلہ حل نہ ہوا۔ اقبال کی طبیعت بگڑنے لگی۔

''اقبال سب ٹھیک تو ہے۔''

''ہاں محمود۔ لیکن سر میں درد ہو رہا ہے اور کچھ چکر بھی آ رہا ہے۔ شاید کمزوری کے سبب۔''

''اچھا۔ تب تو تمہیں گھر جانا چاہیے۔ ہڑتال تو تم وہاں بھی جاری رکھ سکتے ہو۔''

''نہیں یار گھر گیا تو ماں اور بہن پریشان ہو جائیں گی اور ممکن ہے محبت میں آ کر مجھے ہڑتال توڑنے کو کہیں۔''

''اچھا..... تو ایسا کرتے ہیں تم میرے جھونپڑے میں چلو، وہاں تمہیں آرام ملے گا۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ محمود کی بہن رضیہ نے دروازہ کھولا۔

''رضیہ یہ میرے دوست اقبال ہیں جو کہ بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انہیں آرام کرنا ہے۔ تم ان کی دیکھ بھال کرو۔ تب تک میں ہڑتال والی جگہ جا کر مزدوروں سے آگے کے پروگرام کے متعلق مشورہ کرتا ہوں۔''

رضیہ نے سہارا دے کر اقبال کو چارپائی پر لٹایا۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل گئے۔ محبت کی کونپل پھوٹی۔ رضیہ شرما گئی۔ اقبال کے دل میں بھی کچھ ہوا۔ رضیہ اس کا سر دبانے لگی۔ اقبال اس کی نگاہوں اور اس کی خوبصورتی میں گم ہو گیا۔ نگاہوں اور دلوں نے کتنے ہی وعدے ارادے کیے۔

''رضیہ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے۔ میرا سر درد کم ہو گیا۔ چکر کا اثر بھی نہیں رہا۔''

''آپ سلامت رہیں۔آپ کی زندگی سارے مزدوروں کے لیے بڑی قیمتی ہے۔''

''اور تمہارے لیے'' اقبال نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔''

''اس کے لیے آپ کو بھائی جان سے بات کرنی پڑے گی۔ میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔''

وہ شرما کر کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اٹھ گئی۔اقبال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

رقیہ اور گلنار تک یہ خبر پہنچ گئی کہ اقبال کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ دونوں بھاگی ہوئی ہڑتال کی جگہ پہنچیں۔ وہاں محمود سے ملاقات ہوئی۔

''بیٹا اقبال کہاں ہے۔کیسا ہے؟''

''آپ فکر نہ کریں امی، وہ میرے گھر پر ہے اور اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔ چلئے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔''

راستہ اونچا نیچا تھا۔ یکا یک گلنار کا پیر پھسلا۔ وہ گرنے والی تھی کہ محمود نے اسے اپنی بانہوں کا سہارا دیا۔گلنار تو سنبھل گئی لیکن دل بے قابو ہو گیا۔ دو جوان جسموں کے لمس نے دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری پیدا کر دی۔

''سنبھل کر بیٹی۔''

''جی.....جی امی۔''

''ارے امی، بہن آپ..... یہاں'' اقبال نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔محمود باہر چلا گیا۔

''لیٹے رہو بیٹا کیسی طبیعت ہے۔''

''ٹھیک ہوں امی۔گلنار بہن ان سے ملو یہ رضیہ ہے۔محمود کی بہن۔''

دونوں گلے ملیں۔ گلنار نے رضیہ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ رضیہ کھانا بنانے لگی تو گلنار نے پورے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ جس سے جھونپڑا چمک اٹھا۔ رضیہ نے آواز لگائی کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔

''بہن ذرا محمود کو بلا لاؤ۔ سب ساتھ مل کر کھانا کھالو۔ میں تو ہڑتال پر ہوں۔ کم سے

کم آپ لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر ہی تسلی کرلوں گا۔'' اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان آپ کو بلا رہے ہیں کھانے کے لیے۔''

''آپ لوگ کھا لیجیے میں یہاں مزدوروں میں تھوڑی دیر بیٹھوں گا۔شام کو آؤں گا۔''

گلنار کھڑی رہی۔

''آپ جائیے اور کھانا کھا لیجیے۔'' محمود نے بڑے پیار سے کہا۔گلنار کے منھ سے یکا یک نکل پڑا۔

''آپ کے بغیر مجھ سے کیسے کھایا جائے گا۔''

دل کی بات کو دل نے محسوس کیا۔محمود نے کہا۔

''اچھا چلئے۔ راستے میں گلنار نے دوبارہ ڈگمگانے کے ڈر سے محمود کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح چلنے لگی جیسے زندگی بھر کا سہارا مانگ رہی ہو۔محمود نے بھی اس کو اسی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔گھر کے پاس دونوں الگ ہو گئے۔محمود جب گھر کے اندر آیا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ارے واہ۔ یہ اپنا ہی گھر ہے۔رضیہ تم نے کیا صفائی کی ہے، بالکل چمک گیا ہے۔''

''بھائی جان یہ میں نے نہیں گلنار نے کیا ہے۔ میں تو کھانا بنا رہی تھی۔ چلئے سب لوگ کھانا کھاتے ہیں۔''

کھانے کے بعد گلنار زبردستی جوٹھے برتنوں کو دھونے بیٹھ گئی۔ رضیہ نے منع کیا تو بولی۔

''میرا ہی تو گھر ہے'' رضیہ مسکرائی۔محمود نے بھی سنا اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔

''امی اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میں ہڑتال کی جگہ پر مزدوروں کے پاس جاتا ہوں۔محمود! تم امی اور گلنار بہن کو گھر چھوڑ کر وہیں آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم اکیلے مت جاؤ۔ رضیہ! اقبال کو سہارا دے کر کمپنی باغ ہڑتال والی جگہ تک لے جاؤ۔''

راستے میں امی ذرا پیچھے رہ گئیں تو محمود نے گلنار سے کہا۔

''آپ نے صفائی کر کے میرے گھر کو بالکل چمکا دیا۔''

''آپ کو پسند آیا۔''

''اتنا پسند آیا کہ جی چاہتا ہے ان صفائی کرنے والے ہاتھوں اور اس چاند کے چہرے کو چوم لوں۔ اسے اپنے گھر میں رکھ لوں اور زندگی بھر اپنے سے جدا نہ کروں۔''

''اس کے لیے آپ کو امی سے بات کرنی پڑے گی۔''

(۳۲)

بھوک ہڑتال کے بعد بھی مالک کی طرف سے کوئی بات چیت نہ ہونے سے مزدور مشتعل ہوا ٹھے۔انہوں نے سیٹھ کی حویلی تک جلوس نکالنے کا ارادہ کیا۔آناً فاناً ۱۵۰۰ سے زائد مزدوروں کا جلوس تیار ہوا اور حویلی تک آ پہنچا۔

''سیٹھ مردہ باد۔مزدوروں پر ظلم بند کرو۔ہمیں ہمارا حق دو۔انقلاب زندہ باد۔''

اندر سے کوئی آواز نہ آنے پر مزدوروں کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ایک مزدور نے آواز لگائی۔

''ظلم کی حد ہوتی ہے۔اگر سیٹھ یہی چاہتا ہے کہ ہم لوگ بھوکے مر جائیں تو ٹھیک ہے۔ہم بھی سیٹھ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔چلو بھائیوں سیٹھ کی حویلی میں آگ لگا دو اور سیٹھ کو زندہ جلا دو۔وہ بھی دیکھ لے کے جب مزدور بغاوت پر آتا ہے تو سرمایہ دار کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

منشی دوڑتا ہوا آیا۔امین اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

''صاحب....صاحب....فوراً یہاں سے بھاگ جایئے۔مزدوروں کے دلوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔اس آگ کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔وہ حویلی میں آگ لگا رہے ہیں۔آپ فوراً یہاں سے فرار ہو جایئے ورنہ اگر وہ آپ کو دیکھ لیں گے تو پکڑ کر زندہ جلا دیں گے۔''

امین کے ہوش اڑ گئے۔یہ کیا ہو گیا۔اس کا گمان تو اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔وہ بدحواس پیچھے کے دروازے سے نکل بھاگا۔حویلی میں آگ لگا دی گئی۔

امین بھاگتا بھاگتا اقبال کے دروازے تک پہنچ گیا۔اب اس میں اور بھاگنے کی سکت نہ تھی۔اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔اندر سے گلنار نے دروازہ کھولا۔

''تم۔'' گلنار کو وہاں دیکھ امین بھی حیران تھا لیکن یہ وقت حیران ہونے کا نہیں تھا۔

''گلنار مجھے بچالو۔''

''تمہیں بچالوں۔ جس نے میرے بھائی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ تو انسان نہیں درندہ ہے۔ جو غریبوں کا لہو پیتا ہے۔ میں ابھی تیرا انتظام کرتی ہوں۔ تو نے میرے بھائی اقبال اور مزدوروں کو بھو.........''

گلنار نے چیخنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ امین نے اس کے منھ پر کس کر ہاتھ رکھ دیا۔ گلنار تڑپنے لگی لیکن امین نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ گلنار بے ہوش ہوگی۔ امین نے اس کو آہستہ سے دیوار سے لگایا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں گلنار کے گلے کا لاکٹ آ گیا۔ امین اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''یہ تو ویسا ہی لاکٹ ہے جیسا میں نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا اور بعد میں شبنم نے ویسا ہی بیٹی اور چھوٹے بچے کو بھی پہنا دیا تھا۔'' پھر اسے منی بائی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔

اس کا مطلب گلنار میری بیٹی اور اقبال میرا بیٹا ہے۔ اف.....خدایا.....اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

وکیل کے دروازے پر دیر رات دستک ہوئی۔ وکیل نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''ارے امین صاحب.....اس وقت۔''

''ہاں وکیل صاحب۔ معاف کیجیے۔ اتنی رات کو آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔''

''اتنی رات کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔''

''میں ابھی ابھی شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑا آرام کروں گا۔''

''اچھا بولئے کیا وصیت کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں اپنی ساری جائداد آدھی آدھی اقبال اور گلنار کے نام کرنا چاہتا ہوں۔''

"یہ اقبال تو وہی ہے نا جو آپ کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھا ہے اور یہ گلنار کون ہے؟"

"ہاں اقبال وہی ہے اور گلنار میری...... میرا مطلب ہے اس کی بہن ہے۔"

وصیت پر دستخط کرنے کے بعد امین بے نام، بے سمت منزل کی جانب چل پڑا۔ اس کا ضمیر پھر اسے کٹوچ رہا تھا اور اب اس میں ضمیر کو سلا دینے یا دھوکہ دینے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔

''تم۔'' گلنار کو وہاں دیکھ امین بھی حیران تھا لیکن یہ وقت حیران ہونے کا نہیں تھا۔

''گلنار مجھے بچالو۔''

''تمہیں بچالوں۔ جس نے میرے بھائی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ تو انسان نہیں درندہ ہے۔ جو غریبوں کا لہو پیتا ہے۔ میں ابھی تیرا انتظام کرتی ہوں۔ تو نے میرے بھائی اقبال اور مزدوروں کو بھو..........''

گلنار نے چیخنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ امین نے اس کے منھ پر کس کر ہاتھ رکھ دیا۔ گلنار تڑپنے لگی لیکن امین نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ گلنار بے ہوش ہوگی۔ امین نے اس کو آہستہ سے دیوار سے لگایا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں گلنار کے گلے کا لاکٹ آ گیا۔ امین اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''یہ تو ویسا ہی لاکٹ ہے جیسا میں نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا اور بعد میں شبنم نے ویسا ہی بیٹی اور چھوٹے بچے کو بھی پہنا دیا تھا۔'' پھر اسے منی بائی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔

اس کا مطلب گلنار میری بیٹی اور اقبال میرا بیٹا ہے۔ اف.....خدایا.....اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

وکیل کے دروازے پر دیر رات دستک ہوئی۔ وکیل نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''ارے امین صاحب.....اس وقت۔''

''ہاں وکیل صاحب۔ معاف کیجیے۔ اتنی رات کو آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔''

''اتنی رات کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔''

''میں ابھی ابھی شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑا آرام کروں گا۔''

''اچھا بولئے کیا وصیت کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں اپنی ساری جائداد آدھی آدھی اقبال اور گلنار کے نام کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ اقبال تو وہی ہے نا جو آپ کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھا ہے اور یہ گلنار کون ہے؟''

''ہاں اقبال وہی ہے اور گلنار میری...... میرا مطلب ہے اس کی بہن ہے۔''

وصیت پر دستخط کرنے کے بعد امین بے نام، بے سمت منزل کی جانب چل پڑا۔ اس کا ضمیر پھر اسے کٹوچ رہا تھا اور اب اس میں ضمیر کو سلا دینے یا دھوکہ دینے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔

(۳۳)

حویلی میں جیسے ہی آگ لگائی گئی۔ اسی وقت پولیس اور آگ بجھانے والا عملہ پہنچ گیا اور آگ پر فوراً قابو پالیا گیا۔ معمولی سا نقصان ہوا۔ اقبال اور محمود چیخ چیخ کر مزدوروں کو روک رہے تھے کہ اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا لیکن مزدور اس قدر مشتعل تھے کہ ان کی چیخوں پر بھی توجہ نہ کی آخر کار پولیس کاروائی سے معاملہ قابو میں آگیا۔ امین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس افسر نے کہا۔

''مسٹر اقبال۔ آپ فکر نہ کیجیے۔ آپ لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔ دراصل ایک سرکاری افسر رشوت لے کر سرکار کو غلط رپورٹیں دے رہا تھا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے اور جیل میں ہے۔ اس کی گواہی پر ہی ہم امین سیٹھ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

''جناب میرا کبھی ارادہ نہ تھا کہ ہمارے سیٹھ کو کوئی نقصان پہنچے۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ ہمیں ہمارا حق مل جائے۔ یہ سب جو کچھ بھی ہوا، حالات کی مجبوری کے تحت ہوا۔ آخر بھوکے ننگے لوگ کب تک ضبط کرتے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جب پیٹ میں آگ لگی ہو اور کوئی راستہ نہ سوجھ رہا ہو تو پتھر سے پتھر دل ضبط کا بند توڑ دیتا ہے۔ یہ تو فطرت ہے۔ آپ پر اور آپ کے مزدور بھائیوں پر کوئی مقدمہ صادر نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ بس انہیں کہیں کہ جیسے اتنا صبر کیا ہے۔ ویسے کچھ دن اور اگر امین سیٹھ فرار بھی ہو گیا تو اس کی جائداد بکوا کر سرکار آپ لوگوں کا حق آپ کو دے گی۔''

اتنے میں وکیل وہاں آ گیا اور اس نے اقبال کو وصیت دیتے ہوئے رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''اب آپ اور آپ کی بہن گلنار اس ساری جائداد کے آدھے آدھے مالک ہیں۔''

اقبال کچھ سوچتا رہا۔ پھر مزدوروں کو اکٹھا کر کے ان سے مخاطب ہوا۔

"دیکھا ساتھیو! جب انسان کا ضمیر جاگتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ ہم شاید اپنے سیٹھ کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ جب بھی واپس آئیں گے ہم سب ان سے معافی مانگیں گے اور ان کی جائداد انہیں واپس کریں گے۔"

"لیکن تب تک تو آپ ہی مالک ہیں۔ جب تک سیٹھ واپس نہیں آجاتے آپ ان کی جگہ حویلی میں رہ کر ان کا کاروبار چلائیں۔" محمود کے اس مشورے پر سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

رقیہ، اقبال اور گلنار حویلی میں آگئے۔ اگلے دن محمود اپنی بہن رضیہ کے ساتھ ان سے ملنے آیا۔

"ارے آؤ بیٹے محمود، بیٹی رضیہ۔ ارے اقبال، گلنار، دیکھو تو کون آیا ہے۔"

اقبال اور گلنار نے محمود اور رضیہ کو دیکھا تو دونوں کے دل کھل اٹھے۔ اقبال اور محمود اور رضیہ اور گلنار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ سارا دن سب ایک ساتھ رہے۔ لیکن اقبال اور رضیہ اور گلنار اور محمود زیادہ سے زیادہ تنہائی کی تلاش میں رہے اور وقت ملتے ہی ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال دیتے۔ ساتھ جینے مرنے کے وعدہ ہونے لگتے۔ بوڑھی رقیہ کی آنکھوں نے بھی سب کچھ دیکھ لیا اور سارا معاملہ بھانپ لیا۔ جب رات کو سب کھانے پر اکٹھا تھے تو رقیہ نے بات چھیڑی۔

"بیٹا میں چاہتی ہوں کہ اب جبکہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو تمہاری اور گلنار کی شادی کر دی جائے۔"

اقبال نے کہا۔

"ارے امی....."

"نہیں بیٹا۔ اب میں تمہاری ایک بھی نہیں سنوں گی۔"

"لیکن امی.....گلنار میری بڑی بہن ہے۔ پہلے اس کی شادی کر لوں اس کے بعد اپنی شادی۔"

"کیوں نہ دونوں کی شادی ایک ساتھ ہو جائے۔"

"کیسے۔"

"تمہاری رضیہ سے اور گلنار کی محمود سے۔ کیوں گلنار، رضیہ، محمود میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اور پھر ایک ساتھ امی سے لپٹ گئے۔

اقبال کی شادی رضیہ سے اور گلنار کی شادی محمود سے ہوگئی۔

(۳۴)

ڈاکٹر عتیق اپنے اسپتال جو کہ جادونگر میں تھا، کے لیے نکلا ہی تھا کہ راستے میں ایک ضعیف العمر شخص جو کہ بے ہوش پڑا ہوا تھا، کو دیکھ کر اپنی کار رکوائی، اسے ساتھ لیا اور اسپتال لایا۔

''نرس لگتا ہے کہ یہ کمزوری سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ان کو دیکھو۔''

شام کو ڈاکٹر عتیق بوڑھے شخص سے ملنے گیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے بابا۔''

''ٹھیک ہوں بیٹا۔میں یہاں کیسے آیا۔میں تو شاید سڑک پر بے ہوش......''

''جی ہاں۔میں آپ کو یہاں لایا ہوں۔اب آپ اپنے گھر کا پتہ دیجیے تو میں آپ کو وہاں بھجوا دوں۔''

''میرا کوئی نہیں ہے بیٹا۔''

''اچھا تو پھر اس بڑھاپے میں آپ کہاں جائیں گے۔یہیں رہ جایئے۔یہ ایک چیرٹی اسپتال ہے، یہاں مریضوں کی خدمت کیجیے۔آپ کو ثواب بھی ملے گا اور یہاں آرام سے رہ بھی سکتے ہیں۔''

امین نے سوچا کہ یہی اس کے گناہوں کا ازالہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان جیسے غریبوں، مظلوموں اور بے سہاروں جن کا اس نے خون چوس چوس کر کے اتنی بڑی جائداد بنالی تھی کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دے۔

''ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔جو خدا کی مرضی۔''

وہ بوڑھا شخص دن رات مریضوں کی خدمت میں جٹ گیا۔ایک دن ڈاکٹر نے اس

سے کہا۔

''بابا۔ آپ اس قدر جنون سے ان مریضوں کی خدمت میں لگ گئے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ کو بہت ثواب کمانے کی جلدی ہے یا پھر اپنے گذشتہ گناہوں کا ازالہ کرر ہے ہیں۔''

''دونوں ہی باتیں ہیں بیٹا۔''

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا بابا میں تو یوں ہی آپ سے دلگی کرر ہا تھا۔''

بہت دنوں بعد بوڑھے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اسی وقت ایک نرس ڈاکٹر کے پاس آئی۔

''سر کوئی بھی اسٹاف ہمارے ساتھ چلنے کے لیے راضی نہیں ہے۔''

''لیکن تم نے بتایا نہ کہ ماسک پہن لینے سے ہیضہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''بتایا لیکن پھر بھی سب خوفزدہ ہیں۔''

''اوہو...... یہ تو بہت برا ہوا۔ اگر ایک اسٹاف بھی جانے کو راضی ہوتا تو ہم تین بھی اس گاؤں میں پہنچ کر بہت کچھ کر سکتے تھے۔''

''کیا بات ہے بیٹا.....گاؤں......ہیضہ.....''

''کچھ نہیں بابا۔ یہاں سے ۴۰ کیلومیٹر دور ایک گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہے۔ میں نے اسٹاف سے کہا کہ ماسک پہن کر چلیں۔ کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور مریضوں کی خدمت بھی ہو جائے گی لیکن......''

''میں چلتا ہوں بیٹا۔''

''بابا آپ بوڑھے ہیں۔ وہاں دوڑ دھوپ والا کام ہے میں چاہتا تھا کہ کوئی نوجوان....آپ رہنے دیں میں کچھ......''

''کیا بات کرتے ہو بیٹا۔ ابھی تم نے جنون کی بات کی۔ کیا تم بھول گئے کہ خدمت کا جنون مجھ سے وہ کام بھی کرا سکتا ہے جو کہ جوان بھی نہیں کر سکتے۔''

''بابا زندہ باد۔ نرس چلنے کی تیاری کرو۔''

(۳۵)

کافی دن ہو گئے لیکن امین سیٹھ لوٹ کر نہیں آئے۔ اقبال کو بڑی فکر ہوئی، اس نے امی، گلنار، رضیہ اور محمود سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے تھی کہ اب اخبار میں اشتہار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے اخبار میں گمشدگی اور گھر واپس چلے آنے کا اشتہار دے دیا گیا۔

بوڑھے نے گاؤں جا کر ہیضہ کے مریضوں کی وہ خدمت کی کہ ڈاکٹر عتیق حیرت زدہ رہ گیا۔ بوڑھا خود میں ایک تنظیم تھا اور جس طرح وہ خدمت کا کام انجام دے رہا تھا، وہ نوجوانوں کی ایک پوری تنظیم کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر کھو جاتا کہ اس کی ماسک لگانے اور نہ لگانے پر بھی توجہ نہیں رہتی۔ ڈاکٹر عتیق نے کئی بار اس سے کہا۔

''بابا۔ ماسک لگانے کا خیال رکھا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان بیماروں کو ٹھیک کرتے ہوئے تم خود اس بیماری کی زد میں آجاؤ۔ خود کو بچانے کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔''

لیکن بوڑھے کو ہوش کہاں تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پورا گاؤں تو ہیضے کی زد سے بچا لیا گیا لیکن بوڑھا اس کی شدید زد میں آ گیا۔ اسے اسپتال میں داخل کیا گیا۔

ڈاکٹر عتیق گھر پر صبح صبح اخبار دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کی نظر اخبار کے اشتہار پر پڑی جس پر بوڑھے بابا کی تصویر بھی لگی تھی۔

''ہمارے امین سیٹھ صاحب۔ آپ کہاں ہیں۔ مہربانی کر کے واپس آجایئے اور اپنا اتنا بڑا کاروبار اور جائداد سنبھالیے۔ ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم نے آپ کو غلط سمجھا اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ سے کوئی گناہ ہوا تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ آپ کو یہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب آپ سے معافی کے طلب گار اور آپ کے منتظر ہیں۔''

اقبال
منیجر

ڈاکٹر عتیق غور و فکر میں ڈوب گیا۔ اتنا بڑا آدمی جو مجھ جیسی حیثیت والے سینکڑوں کو

خرید سکتا ہے۔ میر املازم بنا ہوا ہے۔ آج اس سے پوچھتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔

(۳۶)

''بابا۔کیسی طبیعت ہے۔''

''لگتا ہے جانے کا وقت آ گیا ہے بیٹا۔''

''بابا آپ مجھے اپنا بیٹا کہتے ہی ہیں یا واقعی بیٹا مانتے بھی ہیں۔''

''کیا کہتے ہو بیٹا۔ جب میں بے ہوش بڑا زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ زندگی بے مقصد، بے معنی ہوگئی تھی۔ تو تم نے مجھے بچایا۔ زندگی کا ایک عظیم مقصد دیا۔ جس سے مجھے اپنے پچھلے گناہوں کی کچھ حد تک تلافی کا موقع نصیب ہوا.....''بوڑھا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔

''دیکھو بابا۔ اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں کچھ حد تک جان گیا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ آپ سمندر نگر کے سب سے بڑے رئیس امین سیٹھ ہیں جو اس ملک کے سب سے بڑے کپڑے کے کارخانے کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی اتنی جائدادیں ہیں کہ نسلوں کی نسلیں بیٹھ کر کھائیں تو بھی ختم ہونے میں عرصہ لگ جائے۔ میں پوری بات جاننا چاہتا ہوں۔ شروع سے آخر تک۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔ بیٹا کہا ہے تو اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بولنا۔''

امین مجبور ہو گیا۔ اس نے اول تا آخر سارا واقعہ کہہ سنایا اور پھوٹ کر رونے لگا۔

''بیٹا میں بہت بڑا گنہگار ہوں۔ اپنی بیوی بچوں کا، مزدوروں کا.....سب کا۔''

''نہیں بابا۔ آپ اب گنہگار نہیں رہے۔ آپ کی خدمت خلق نے آپ کے سارے گناہوں کا ازالہ کر دیا۔ پوری امید ہے کہ خدا بھی آپ کو معاف کر دے گا۔ کیونکہ آپ کے

بچوں اور مزدوروں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ یہ دیکھئے۔'' اخبار سے اشتہار والا صفحہ کھول کر اس نے امین کے آگے رکھ دیا۔

''خدا ترا شکر ہے۔ لیکن بیٹا میں یہاں سے سیدھا اب مالک حقیقی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اب میں گھر بار، دھن دولت کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بس یہیں مریضوں کی خدمت کرتے ہوئے مر جانا چاہتا ہوں۔''

''جیسی آپ کی مرضی بابا۔ لیکن آپ کے بچوں کو اطلاع تو دے دوں کہ آپ یہاں ہیں۔''

''بیٹا پھر شاید میں بچوں کی محبت میں پھنس کر اس عظیم مقصد کو چھوڑ بیٹھوں۔ میرا ضمیر بڑا لچکدار ہے۔ زندہ، مردہ ہوتا رہتا ہے۔ تم بچوں کو اطلاع دے کر مجھے اس عظیم مقصد سے دور مت کرو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ بچوں کو نہیں لیکن منیجر کو تو اس کے مالک کی اطلاع دے سکتا ہوں۔ ان کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ آپ کے بچے ہیں۔ آپ ان سے مل کر دل کو ٹھنڈا بھی کر لیجیے گا اور ان سے کہہ بھی دیجیے گا کہ آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ کاروبار وہ سنبھالیں اور یہاں آتے جاتے رہیں۔ اس طرح آپ کا دل بھی ٹھنڈا رہے گا اور آپ کا عظیم مقصد بھی پورا ہوتا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔''

(۳۷)

''منیجر صاحب.....'' منشی دوڑتا ہوا آیا۔ ''مالک کی خبر مل گئی۔ جادونگر کے ایک اسپتال سے تار آیا ہے۔''

''جلدی دکھاؤ۔''

تار پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں خوشی سے نم ہوئی جا رہی تھیں لیکن آخری سطر نے اس کے خوشی کے آنسوؤں کو غم کے آنسوؤں میں تبدیل کر دیا۔

''ان پر ہیضہ کا شدید اثر ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو آجایئے۔''

رقیہ، گلنار، رضیہ اور محمود کو ساتھ لے کر اقبال اسی وقت جادونگر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچ کر نرس سے دریافت کیا۔

''امین سیٹھ کس نمبر کے کمرے میں ہیں۔''

''کمرہ نمبر ۱۰ میں لیکن......''

نرس کے جملے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے اقبال بھاگتا ہوا امین کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں سناٹا تھا۔ امین مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ ڈاکٹر عتیق خاموش کھڑا تھا۔ اس نے اقبال سے کہا۔

''آپ نے آنے میں تھوڑی دیر کر دی۔''

رقیہ، گلنار، رضیہ، محمود بھی اندر آ گئے۔ وہ سب امین کے جسم سے لپٹ کر رونے لگے۔

اقبال نے خوب رو کر دل ہلکا کرنے کے بعد ڈاکٹر سے کہا۔

''ڈاکٹر یہ ہمارے مالک ہیں۔ ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔ کیا ہم ان کے جسد خاکی کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

''بالکل لے جا سکتے ہیں جناب اور چونکہ یہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور حقیقت کو اب کھل بھی جانا چاہیے تو میں آپ کو بتا دوں کہ ان کے وارث بھی موجود ہیں۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔''

''کیا.....کہاں ہیں۔ہم ان کے والد کی ساری جائداد انہیں سونپ دیں گے۔''

''آپ کو ان کی جائداد کسی کو سونپنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ ان کے بیٹے اور گلنار ان کی بیٹی ہے۔''اور پھر ڈاکٹر نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

اقبال اور گلنار زار و قطار رونے لگے۔روتے روتے اقبال نے امین کے سر سے چادر ہٹائی تو اسے یوں لگا جیسے کہ ان لوگوں کے طویل انتظار کے بعد ان کے والد کی آنکھیں بند ہوئی ہوں۔چہرے پر عجیب دلکش سکون تھا۔اقبال کو یوں لگا جیسے اس کے والد کے مردہ چہرے کے نور سے پورا کمرہ روشن ہو گیا ہو۔

وحشت محبت

(۱)

سفید فلک رسا عمارت پر اس نے سر اٹھا کر نظر ڈالی۔ شہر کا سب سے بہترین کالج، جہاں اب اسے داخلہ لینا تھا۔ گاؤں کا سیدھا سادہ نوجوان جس کی ماں بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی۔ اس کے والد زمیندار تھے لیکن ان کی خواہش تھی کے بیٹا بی. اے پاس کر کے تحصیل دار بن جائے۔ اصغر چاہتا تھا کہ اس کی زندگی گاؤں کی سادگی اور سکون میں ہی بسر ہو جائے لیکن والد کی خواہش کے پیش نظر وہ مجبور ہو گیا۔ آج اس نے شہر میں قدم رکھا جہاں پیچیدہ زندگی تھی۔ قدم قدم پر فریب اور بے ایمانی کا ڈر تھا۔

وہ کالج کے بڑے میدان میں پہنچا جہاں کونے میں بائیں جانب بنے ایک کمرے کی کھڑکی سے داخلے کے فارم بانٹے جا رہے تھے۔ لڑکے لڑکیاں سب ایک ہی قطار میں کھڑے تھے۔ یہ منظر اصغر کے لئے نیا تھا۔ وہ بھی قطار میں لگ گیا۔ اس کے آگے ایک شہر کی تہذیب یافتہ لڑکی کھڑی تھی جس کے چست کپڑوں سے جسم کا عضو عضو پھوٹ رہا تھا اور دل میں ہوس کی چنگاری کو بھڑکا رہا تھا۔ لڑکی نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی نظروں سے حقارت جھانکنے لگی۔ پیچھے اصغر کھڑا تھا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی یہ گاؤں کا لڑکا ہے۔ اصغر نے ویسے تو کوٹ اور پینٹ پہن رکھا تھا لیکن وہ اس قدر ڈھیلا ڈھالا تھا کہ کرتے، پائجامے کا

احساس دلاتا تھا۔

''مسٹر'' لڑکی اس سے مخاطب ہوئی۔

''جی.........جی'' وہ تھوڑا گھبرا گیا۔

''آپ میری جگہ دیکھتے رہیں گے پلیز۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے۔''

اصغر کے پیچھے قطار میں لگے ہوئے لڑکے نے کہا۔

''اس گاؤں والے کی قسمت بھی کیا قسمت ہے۔ کپڑا پہننے کا شعور نہیں ہے اور دیکھو اتنی خوبصورت لڑکی بات کرتی ہے۔ ابے.....تو میرے پیچھے آجا۔ تو تو کچھ کرے گا نہیں۔ میں کم سے کم اس کے جسم کے ابھرے ابھرے حصوں سے حسن کی گرمی حاصل کرلوں گا۔ چل پیچھے آجا۔''

اس کے پیچھے کھڑے چار دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

''دیکھنے میں گاؤں سے ضرور آیا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کے آپ اس طرح بدتمیزی کریں۔''

''ابے، گاؤں کا جاہل ہو کر ہم شہر کے تہذیب یافتہ لوگوں کو بدتمیز کہتا ہے۔''

ایک زوردار چانٹا اصغر کے گال پر پڑا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔ اس کی غیرت نے جوش مارا۔

''شہر کے تہذیب دار لونڈے۔ تجھے اس بدتمیزی کی سزا ملنی چاہئے۔''

اصغر کے زوردار گھونسے سے وہ زمین پر دوہرا ہو کر تڑپنے لگا۔ اس کے دوستوں نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو چاروں ایک ساتھ اصغر سے بھڑ گئے لیکن اصغر کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں سے دھوکہ کھا گئے اور اس میں چھپے اس کے کسرتی بدن کو نہ دیکھ سکے۔ حالانکہ انھوں نے اصغر پر خوب وار کئے۔ اصغر کے ماتھے سے خون بھی نکلنے لگا لیکن وہ اس کے سبھی وقت پر چلائے گئے زوردار گھونسوں کی تاب نہ لاسکے اور گرتے پڑتے اپنے ساتھی کو لیکر بھاگ کھڑے ہوئے۔

''معاف کیجئے مجھے دیر ہوگئی۔ وہ لڑکے آپ سے لڑ کیوں رہے تھے۔ ارے آپ کے ماتھے سے تو خون بہہ رہا ہے۔''

''آپ کی وجہ سے یہ لڑائی ہوئی ہے۔'' آگے قطار میں کھڑے لڑکے نے کہا۔

''میری وجہ سے......کیسے۔''

لڑکے نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''معاف کیجئے میں.......''

''اس میں آپ کی کیا غلطی ہے۔ چھوڑئے......''

''یہ رومال لیجئے اور اس سے ماتھے کا خون پونچھ لیجئے۔'' لڑکی نے کچھ اس ادا سے کہا کہ اصغر کے دل نے سمجھا کے لڑکی کے دل میں اس کے پیار کا چراغ جل اٹھا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے رومال لیا اور اس سے ماتھے کا خون پونچھنے لگا۔ محبت کے رومال پر خون کے قطرے بڑے حسین لگ رہے تھے۔ اصغر محبت اور خون کی اس داستان کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کے فارم لینے کا نمبر آیا۔ اس کے بعد اصغر کا۔ لڑکی نے اصغر سے وداع لی اور چلی گئی۔

(۲)

اس کے ماتھے پر اچھا خاصا زخم تھا۔ اسے فادر ولسن یاد آ گئے جب وہ بچپن میں کبھی زخمی ہو جاتا تو فادر ولسن کے پاس چلا جاتا تھا جو اس کی مرہم پٹی کرنے کے بعد اسے مٹھائی بھی دیتے تھے۔

''دو روپے دیجیے۔''

''دو روپے۔''

''جی ہاں۔ مرہم پٹی کے دو روپے ہوئے۔''

''مہنگا شہر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دو روپے ڈاکٹر کو دیے اور بازار کی جانب چل پڑا۔ شہر کی ایک پرانی گلی میں بوسیدہ مکان کے اندر کرایہ کا ایک کمرہ۔ دس روپیہ مہانا۔ اگر اچھی رہائشی جگہ فلیٹ یا کمرہ لیتا تو کمرے کے لیے کم از کم سو روپے اور فلیٹ کے لیے کم از کم ۳۰۰ روپے مہانا درکار تھے۔ یہاں اس کی گاؤں کی عقل کام آئی۔

''تعلیم تو ٹھیک ٹھاک کمرے میں بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ عیش و آرام سے رہنے نہیں۔ دس روپے مہانا تک کا کمرہ ٹھیک ہے۔ آخر پیسے بھی تو اپنے ہی بچیں گے۔''

آج صبح ہی پچاس روپے کا منی آرڈر آیا تھا۔ ۱۰۰ روپے پہلے سے ہی اس کے پاس تھے۔ اس نے خود کھانا بنانے کے لیے اسٹو اور تیل اور کھانے پینے کا مہینے بھر کا راشن خریدا اور واپس کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی گھر کے مالک مولانا بخش نے آواز دی۔

''ارے آپ آ گئے۔ اتنا سامان۔''

''جی مہینے بھر کا راشن ہے۔''

بیٹا تم سے ایک التجا کرنی تھی۔ اگر تم اگلے مہینے کا کرایہ ابھی ایڈوانس میں دے دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یکا یک کچھ ضرورت آن پڑی ہے۔''

مولانا بخش کے پاس دو مکان تھے جس میں سے ایک اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ دس کمروں والے اس مکان میں دس کرائے دار تھے اور یہی اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ بھی تھا۔

''کیا سوچنے لگے بیٹا۔'' مولانا بخش نے اپنی بوڑھی کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''جی......جی......کچھ نہیں۔'' اصغر کا خیال منتشر ہو گیا۔

''یہ لیجیے۔''

دس روپئے کا نوٹ ہاتھ میں لیتے ہی بوڑھے کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''بیٹا تم تھکے لگ رہے ہو۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں چائے بھجواتا ہوں۔''

دس فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا کمرہ۔ ایک طرف واحد بڑی کھڑکی لیکن روشنی اور ہوا کے لیے مناسب۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک لڑکی کھڑی تھی جو اٹھارہ انیس سال کی لگ رہی تھی۔

''چائے۔''

''جی شکریہ۔ آپ شاید مولانا صاحب کی.....''

''بیوی ہوں۔''

''بیوی.....''

ابھی کچھ دیر پہلے اس کے خیال نے جو لڑکی کا تصور باندھا تھا، وہ اب گھریلو مجبور عورت کی شکل میں ڈھل گیا۔ چائے ختم ہوئی۔ وہ لڑکی نما مجبور کمسن گھریلو عورت پیالی لے کر چلی گئی۔

''شاید یہ روایت بھی شہر کی تہذیب میں شامل ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور آرام کرنے کے لیے پلنگ پر لیٹ گیا۔

شام کو پھر دروازے پر دستک ہوئی۔

''ارے یار تم۔'' سامنے اس کا پرانا دوست کھڑا تھا جو کہ تحصیل دار کا بیٹا تھا۔

''ہاں یار۔ میں گاؤں گیا تھا۔ وہاں سنا کہ تم بھی پڑھنے کے لیے شہر آ گئے ہو۔ تمہارے والد سے تمہارا یہاں کا پتہ لے لیا۔ کالج میں تو ملاقات ہوتی رہے گی سوچا پہلے یہیں تم سے مل لوں۔''

''یار کتنے دنوں کے بعد ملے ہیں۔ یاد ہے جب گاؤں میں نمائش لگا کرتی تھی تو ہم کئی بار دیکھنے جایا کرتے تھے۔'' اصغر نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''یار اصغر۔ یہاں بھی نمائش لگی ہوئی ہے۔ تو کیوں نہ ابھی وہیں چل کر پرانی یادوں کو تازہ کریں۔''

''ضرور۔''

وہ دونوں نمائش گاہ میں گھومتے رہے۔ اسٹوڈیو میں فوٹو کھنچوانے کے لیے بھی گئے۔ وہیں اصغر کی نظر اس لڑکی پر پڑی جو اسے کالج میں ملی تھی۔ وہ فوٹو کھنچوا چکی تھی۔

''چلو رانی۔'' اس کی سہیلیوں نے کہا۔

''رانی۔ کیا خوبصورت نام ہے۔''

''کس سوچ میں پڑ گئے اصغر۔''

''اونہو..... کچھ نہیں یار.....''

(۳)

دوسرے دن صبح وہ کالج جانے کے لیے تیار ہوا۔ سرسوں اور اخروٹ کے مرکب سے بنا ہوا تیل سر پر لگایا جو اس کے والد نے خاص طور سے دیا تھا اور کہا تھا کہ بیٹا اس سے عمر بھر آدمی کے بال سفید نہیں ہوتے۔ بالوں میں کنگھا کر کے جیسے ہی دروازے سے نکلا، مولانا بخش کی بیوی نصرت آتی ہوئی دکھائی پڑی۔

''آپ۔''

''آج آپ کے کالج کا پہلا دن ہے، میں شگون کے طور پر آپ کے لیے مٹھائی لائی ہوں۔ یہ لیجیے۔''

''شکریہ۔''

باہر آ کر اس نے رکشا لیا اور کالج آ گیا۔ وہاں ہوا میں رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ شوخ کہکہوں نے فضا میں زندگی بھر دی تھی۔ نئی طرز کے ملبوس اور اس کے درمیان اصغر کا پرانی وضع کا لباس۔ جو لڑکے اصغر سے پٹے تھے، وہ بھی وہاں تھے۔ ایک بار وہ اصغر کو دیکھ کر اس کا مزاق اڑانے کے انداز میں مسکرائے لیکن اصغر سے نظریں ملتے ہی سہم گئے اور وہاں سے کھسک گئے۔ اصغر سمجھ گیا کہ پرانے طرز کے لباس کے ساتھ اس کا کالج میں گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ کلاس میں گیا جہاں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے یہ پسند نہیں آیا۔ وہ کونے والی کرسی پر تنہا بیٹھ گیا۔

تاریخ کے پروفیسر نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے حالات اور واقعات پر روشنی ڈالی۔ گھنٹہ ختم ہوا تو وہ بھی باہر آ گیا۔ اسے بچپن سے ہی تنہائی پسند تھی اس لیے کالج کے باغ میں ایک درخت کے نیچے تنہا بیٹھ کر پڑھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔

''ہیلو۔'' یہ رانی تھی۔

''رانی.....آپ۔''

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم اور وہ بھی گھر کا۔''

''گھر کا......''

''جی ہاں......میرا اصلی نام تو صنوبر ہے۔ اچھا آپ نے کسی سہیلی کو میرا گھر والا نام پکارتے ہوئے سن لیا ہوگا۔''

''جی......جی.....ہاں۔''

''یہ قلم تو بہت خوبصورت ہے۔ کہاں سے لیا۔''

''کل نمائش گاہ سے۔''

''کل تو میں بھی وہاں گئی تھی، لیکن مجھے یہ دکھائی نہیں دیا۔ شاید ختم ہو گیا ہوگا۔''

''اگر یہ آپ کو اتنا پسند ہے تو آپ اسے رکھ لیجیے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ ایسے کیسے۔''

''کیوں نہیں.....کبھی آپ کی کوئی چیز مجھے اچھی لگی تو وہ میں آپ سے لے لوں گا۔''

''اچھا.....'' صنوبر نے مسکرائی اور پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔ میں آپ کو پسند آنے والی چیز کی منتظر رہوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ شرماتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

(۴)

''آ گئی بیٹی۔ بڑی خوش نظر آ رہی ہو۔''

''ہاں ماں۔آج میں نے اپنے کالج کے ایک لڑکے کو بے وقوف بنایا اور اس سے یہ قلم اڑا لیا۔''

''بیٹی یہ اچھی بات نہیں۔''

''چھوڑو ماں......ہم کون سے اچھے ہیں۔''

صنوبر کی بات اس کی ماں کے دل پر لگی۔

''تو تم کچھ بھی نہیں بھولی۔''

''ماں زندگی اور اس کے واقعات بھولنے والے نہیں ہوتے۔ مجھے سب یاد ہے۔ میرا بچپن، تمہاری جوانی۔ میری جوانی تمہارا بڑھاپا......سب کچھ۔''

ماں ماضی کے اوراق میں کھو گئی۔

طوائف کی بیٹی طوائف خانے کو روشن کر رہی تھی۔

ہر دن گھنگھروؤں کی جھنکار اور ہر رات نئے نئے مردانہ جسموں کا لطف۔لیکن وہ کسی ایک کی ہونا چاہتی تھی۔عورت پن کا یہی تقاضا تھا۔وہ اس گندے ماحول سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔آخر کار اس کی دعا نے اثر دکھایا۔نواب تیمور جنگ ایک دن اس کے پاس آئے اور اس کے سلیقہ مند حسن سے متاثر ہوئے۔

''بولو میری جان کیا چاہیے۔''

''مجھے جو چاہیے وہ آپ مجھے نہیں دے سکتے نواب صاحب۔''

''مانگ کر دیکھو۔''

''میں صرف آپ کی ہو کر رہنا چاہتی ہوں۔ کسی بھی طریقے سے۔ میرے جسم کے عضو عضو پر آپ کا حق ہوگا۔ یہ بھری جوانی صرف آپ کی ہوگی۔ بس مجھے اس زندگی سے دور لے جایئے۔''

نواب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

بولی لگائی گئی۔ نواب صاحب نے پوری قیمت ادا کی اور صنوبر کی ماں اس کی داشتہ بن کر زندگی کے دن گزارنے لگی۔ نواب نے کچھ جائداد بھی اس کے نام کر دی۔ بعد میں جب صنوبر نے جنم لیا تو بھی نواب صاحب اسے بیوی نہ بنا سکے۔ وہ داشتہ ہی رہی۔ لیکن اسے خوشی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم اور اچھی زندگی دے سکتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد نواب صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی طرف سے آنے والی آمدنی بند ہوگئی لیکن جائداد کے کرائے سے بھی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔

''کہاں کھوگئی ماں...... بھوک لگی ہے۔ کھانا دو۔''

بوڑھی چونک پڑی۔ ''ہاں..... ہاں..... بیٹی.... ابھی لاتی ہوں۔''

(۵)

آج وہ بہت خوش تھا۔اس کے نئے کپڑے سل کر آ گئے تھے۔اس نے ایک پینٹ شرٹ نکالی اورزیب تن کی۔

''واقعی میں اس نئے طرز کے لباس میں بہت خوبصورت لگتا ہوں۔''

''میں اندر آسکتی ہوں۔''

''ارے تم.....آؤ آؤ۔'' روز روز کی ملاقات نے نصرت اور اصغر کے درمیان بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

''یہ سج دھج کر کہاں جا رہے ہو۔''

''کالج ہی جا رہا ہوں۔تم کیا کہیں باہر سے آ رہی ہو۔''

''ہاں.....میں درگاہ گئی تھی منت ماننے۔''

''کیسی منت۔''

''وہ.....وہ.....مولانا صاحب مجھ سے ایک بچہ چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ شرماتے ہوئے بھاگ گئی۔

''مولانا صاحب کو اس عمر میں بچہ چاہیے۔''اصغر زیر لب مسکرایا اور کالج کے لیے چل پڑا۔

''آج آپ بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔''

''آپ بھی ان کپڑوں کے اندر خوبصورتی تلاش کرتی ہیں۔''

''خوبصورتی وہ جس کو دیکھا جا سکے، محسوس کیا جا سکے، جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے، زندگی کو خوش گوار بنایا جا سکے۔جس سے لطف اندوز ہوا جا سکے۔جیسے دولت۔''

''دولت۔''

''ہاں دولت جس سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔جس کی ضرورت ساری ضرورتوں سے بڑھ کر ہے اور جو ساری ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے۔''

اصغر اس کی باتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

(٦)

چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ عظمت بھی اپنے پہاڑی والے بنگلے پر جانے والا تھا جو شہر سے پانچ میل دور تھا۔ اصغرا اپنے گاؤں جانے والا تھا۔ صنوبر چاہتی تھی کہ کوئی لڑکا یہیں رک جائے جس کے ساتھ وہ ہوٹل کے کھانے اور سنیما ہال کا لطف لے سکے، لیکن سب نے کچھ نہ کچھ پروگرام بنایا تھا۔ وہ مایوس ہوکر اپنے گھر لوٹی تو ماں کو بستر پر پایا۔

''کیا ہوا ماں۔''

''کچھ نہیں بیٹی، ذرا چکر آ گیا''۔

''ذرا چکر نہیں بلڈ پریشر بڑھ گیا ہوگا۔ میں ڈاکٹر کو لاتی ہوں۔''

وہ ڈاکٹر لینے گئی تو راستے میں اسے عظمت ملا۔ صنوبر کی بات سن کر وہ بھی ساتھ چل پڑا۔

لیکن ڈاکٹر کے آتے آتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ ماں دنیائے فانی سے کوچ کر چکی تھی۔

''اب میرا کیا ہوگا ماں۔ اتنی بڑی دنیا میں تنہا کس کے سہارے زندہ رہوں گی۔'' وہ عظمت کے پہلو میں سمٹ کر رونے لگی۔

عظمت تدفین کا کام مکمل کروانے کے بعد صنوبر کے پاس واپس آیا۔ وہ اب تک رو رہی تھی۔

''عظمت میرا کیا ہوگا۔ میں اکیلے یہاں کیسے رہوں گی۔''

''اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں، حالانکہ یہ وقت اس قسم کی باتوں کا نہیں ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''

''کیا۔''

''میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے، تم پر مرتا ہوں لیکن تمہارا رجحان اصغر کی جانب دیکھ کر میں تم سے پیار کا اظہار نہیں کر پایا۔ اگر تمہارے اور اصغر کے درمیان کچھ نہ ہو تو میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

صنوبر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عظمت امیر باپ کا بیٹا تھا اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی صنوبر کو خواہش تھی۔

''اصغر صرف میرا معصوم دوست ہے۔ کیا تم واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''بالکل۔''

''کب۔''

''ابھی۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ ہم امی ابو کے پاس چلیں گے اور ان سے اجازت لے کر شادی کر لیں گے۔''

''لیکن اگر تمہارے امی، ابو......''

''تم گھبراؤ نہیں امی، ابو میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں کپڑے لے کر آتی ہوں۔''

اصغر نے جب دو دن تک صنوبر کو کالج میں نہیں دیکھا تو اس کے گھر گیا۔ وہاں تالا لگا تھا۔ پاس کے دوکاندار سے دریافت کیا تو جواب ملا۔

''ارے صاحب، بڑی بے غیرت لڑکی تھی۔ پرسوں ہی اس کی ماں مری اور جس لڑکے نے اس کی ماں کی تدفین میں مدد کی، اسی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اسی دن یہاں سے چلی گئی۔ ایک گھنٹہ بھی ماں کا غم نہیں منایا اور خوشی خوشی اس امیر زادے کی آغوش میں سمٹ گئی۔''

''کہاں گئی۔''

''یہ تو معلوم نہیں۔ اپنی ساری جائداد بھی اس نے فروخت کر دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔''

اصغر ٹوٹ گیا، بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے کی جانب آرہا تھا کہ راستے میں ایک شرابی ملا جو دنیا سے بے نیاز اپنی دھن میں مست لڑکھڑاتا ہوا چلا جارہا تھا۔

''شاید شراب اس وقت مجھے سہارا دے۔''

وہ بار میں گیا اور پوری بوتل پی ڈالی۔ جب کچھ سرور چڑھا تو اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہوا۔ کمرے پر آتے آتے اس پر نشہ پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔

''ارے تم لڑکھڑا کیوں رہے ہو۔'' نصرت نے اسے سہارا دیا اور اس کے کمرے میں لے گئی

''تم نے شراب پی۔ شکر کرو کہ مولانا صاحب گھر میں نہیں ہیں ورنہ بہت برا ہوتا۔''

''جو میرے ساتھ ہوا ہے اس سے برا کیا ہوتا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلنگ پر گر پڑا۔ نصرت بھی اس کے اوپر گر پڑی۔ ہوس کے جذبے جاگ اٹھے۔

''تم بہت اچھے ہو، جوان ہو، خوبصورت ہو۔ کسی بھی عورت کی جنسی خواہش کو پورا کر سکتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اصغر کو اپنی بانہوں میں کھینچ لیا۔ اصغر کے لب جب اس کے گدار سینے سے ٹکرائے تو وہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ شراب اور شباب کے امتزاج نے ایک نئی عبارت لکھ ڈالی۔

جب اصغر کو ہوش آیا تو اس نے خود کو بستر پر برہنہ پایا۔ پاس ہی نصرت بھی برہنہ پڑی تھی۔

''یہ کیا..... یہ سب کیا ہو گیا.....'' نصرت کی آنکھ بھی کھل گئی اس نے ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا۔ مولانا صاحب کی دو دن کی گھر سے دوری نے مجھے بھرپور مردانگی کا لطف عطا کیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اصغر کے ہونٹوں کو چوم لیا اور اپنے برہنہ سینے کو اس کے برہنہ سینے پر رکھ دیا۔ ہوس کی آگ ایک بار پھر جل اٹھی۔

اصغر نے گاؤں جانے کے لیے اپنا سوٹ کیس اٹھایا تو نصرت نے دبی زبان سے سوال کیا۔

''واپس کب آؤ گے۔''

''چھٹیاں ختم ہونے کے بعد۔''

نصرت مایوسی سے اس سے لپٹ گئی اور اس کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے بولی۔

''یہ لو مٹھائی.... شگون ہے.... میں انتظار کروں گی۔''

اصغر جب گاؤں واپس آیا تو والد کو بیمار پایا۔ گاؤں میں سہی علاج نہ ہونے سے بیماری آخری مرحلے میں تھی۔ باپ موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''آپ نے مجھے اپنی بیماری کے متعلق خط کیوں نہیں لکھا۔''

''بیٹا، اس سے تیری پڑھائی متاثر ہوتی۔ میری دلی خواہش تھی کہ تجھے تحصیل دار کی وردی میں دیکھوں لیکن شاید زندگی باقی نہیں ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو بیٹے کہ تم تحصیلدار ضرور بنو گے۔ تا کہ میرا جسم نہیں تو میری روح ضرور تمہیں دیکھ سکے کہ میرے بیٹے نے اپنے باپ کی خواہش کو پورا کیا۔''

اصغر سے وعدہ لے کر اس کا باپ دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اب اصغر کے پاس زندگی کا ایک مقصد تھا۔ تحصیل دار بننا۔ باپ کی خواہش کو پورا کرنا۔ وہ واپس شہر لوٹ آیا۔

(۷)

عظمت جب صنوبر کو لے کر گھر آیا تو یہاں معاملہ بالکل اس کی سوچ کے برعکس نکلا۔ اس کے والد اور والدہ نے اختلاف کا طوفان کھڑا کر دیا۔ عظمت ان کی کروڑوں کی جائداد کا اکیلا وارث تھا۔ اس کی شادی اور آئندہ کی زندگی کے متعلق ان کے کئی منصوبے تھے، جو دھرے کے دھرے رہ گئے۔ عظمت صنوبر کے حسن میں اتنا دیوانہ ہو گیا کہ گھر بار زمین جائداد سب چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔ صنوبر بھی جانتی تھی کہ آخر کار والدین کو عظمت کے آگے جھکنا پڑے گا۔ اس لیے وہ بھی ہر طریقے سے عظمت کا ساتھ دے رہی تھی۔ آخر کار ماں باپ کو ہار ماننی پڑی اور دونوں کا نکاح ہو گیا۔ لیکن صنوبر کو کبھی اپنے ساس سسر کا پیار نہیں ملا۔ اس نے بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ آخر بوڑھی، بوڑھے کے دن ہی کتنے ہیں۔ آج مرے، کل دوسرا دن۔ اسی امید پر وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ عظمت کی ماں اپنی بوڑھی سہیلیوں میں اکثر کہتی۔

"میں کہتی ہوں کہ اس کا خاندان ہی ایسا ہے جو بھولے بھالے نوجوانوں کو پھنسانے میں ماہر ہے۔ ورنہ کوئی شریف لڑکی اس طرح کسی کے ساتھ آتی ہے۔ وہ معصوم اور مجبور نہیں ہے بلکہ میرے سفید بال کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔"

بات بھی کچھ سہی تھی۔ صنوبر کو اکثر اصغر کا خیال آتا رہتا۔ اس کی معصوم مسکراہٹ۔ چونکہ عظمت اسے مل چکا تھا۔ دولت اس کے پاس تھی اس لیے اب اس کا ذہن ادھوری خواہشوں کی تکمیل کا راستہ تلاش کرنے لگا تھا۔ اصغر کی یادیں ہمہ وقت اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔

عظمت کاروبار کے سلسلے میں ایک ماہ سے زاید دنوں کے لیے سفر پر جا رہا تھا۔ اس

نے صنوبر کو بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔

''میری جان۔ مجبوری ہے۔ تم فکر مت کرو۔ کام ختم ہوتے ہی میں فوراً واپس آجاؤں گا۔''

''میں تم کو ایک اچھی خبر سنانے والی تھی لیکن اب تم مجھ سے دور ہو رہے ہو۔ اس لیے......''

''کون سی خبر۔''

صنوبر شرما گئی.....''وہ تم آنا تب بتاؤں گی۔''

''تمہیں میری قسم۔''

صنوبر نے اپنا چہرا اس کے سینے میں چھپاتے ہوئے کہا۔''تم باپ بننے والے ہو۔''

''کیا....''عظمت خوشی سے جھوم اٹھا۔

''دیکھو میری جان۔ تم اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔ واپس آنے کے بعد میں تمہارا خیال رکھوں گا۔''

جب عظمت کے ماں باپ نے یہ خبر سنی تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ اس کی ماں چیخنے لگی۔

''پتہ نہیں کس کا گناہ ہے جو ہمارے خاندان کے گلے مڑھ رہی ہے۔''

عظمت کے جانے کے بعد اس کے ماں باپ کے برتاؤ میں اور تلخی آ گئی لیکن صنوبر کو اب اس کی کچھ پرواہ نہیں تھی۔ اب اس کا بال بھی بانکا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اب اس گھر کا نیا مالک آ رہا تھا۔

ایک ماہ بعد عظمت کا تار آیا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی صنوبر خاص طور پر اپنا خیال رکھنے لگی۔ ایک دن اچانک خبر آئی کہ جس ریل گاڑی سے عظمت واپس آ رہا تھا، وہ حادثے کا شکار ہوگئی اور مرنے والوں کی فہرست میں عظمت کا بھی نام تھا۔ صنوبر کی دنیا اجڑ گئی۔ کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔ ساس سسر کے ظلم اور بڑھ گئے۔ وہ اسے گھر سے نکالنا چاہتے تھے۔ صنوبر نے اپنے پیٹ میں پل رہے عظمت کے بچے کی دہائی دی کہ وہ اس گھر کا چشم و چراغ ہے

لیکن سب بے سود۔ اس کی ساس نے چیختے ہوئے کہا۔

"پہلے تو اس گھر کے چشم و چراغ کو پھنسایا، پھر اسے ڈائن بن کر کھا گئی اور اب نہ جانے کس کے گناہ کو اس گھر کا چشم و چراغ کہہ رہی ہے۔ اپنا سامان باندھ اور اپنی پاپ کی گٹھری کو لے کر گھر سے نکل۔ ہم سے ترا کوئی واسطہ نہیں۔"

(۸)

نصرت اس کے کمرے میں داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں سیب تھا۔ وہ اصغر کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''کیوں مسکرا رہی ہو۔''

''میں سیب کھا رہی ہوں۔ بہت اچھا ہے۔''

''اچھا بہت میٹھا ہے۔''

''نہیں بہت کھٹا لیکن بڑا مزیدار۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شرما کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اصغر بڑبڑایا۔ ''کھٹا اور بڑا مزیدار۔''

مولانا بخش اس کے کمرے میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وارد ہوئے۔

''کیا بات ہے چاچا۔ بڑے خوش لگ رہے ہو۔''

''ہاں بیٹا...... درگاہ والے بابا نے منت پوری کر دی۔ میں باپ بننے والا ہوں۔''

''اچھا.....''

''لو مٹھائی کھاؤ اور اپنے کالج کے دوستوں کو بھی کھلانا۔''

''اصغر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بچہ..... نہیں.....

اس کے ضمیر نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ وہ کالج نہ جا سکا۔ اس نے ضمیر کے سوالات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ دن رات ندامت کے سمندر میں گم رہنے لگا۔

''یار کیا بات ہے۔ اچھے تو ہو۔ چار دن سے اسکول نہیں آئے۔ ارے تمہیں تو بخار

ہے چلو ڈاکٹر کے پاس۔''تحصیل دار کے بیٹے نے آتے ہی اسے اٹھایا۔

''کچھ نہیں یار ہلکا بخار ہے۔''

''ایسے کیسے، چلو میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''آپ اپنی صحت کا خیال رکھئے۔لگتا ہے کہ کوئی غم آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔غموں کو چھوڑیے۔خوش رہا کیجیے۔میں دوائیں دے دیتا ہوں۔''

''تمہیں کون سا غم لگ گیا یار کہیں صنوبر کا غم.......''

''نہیں یار.....بس یہی فکر لگی رہتی ہے کہ امتحان میں اول آؤں گا یا نہیں۔''

''چھوڑو یار.......تم محنت کر رہے ہو۔ضرور اول آؤ گے۔میں تو سمجھا کہ تمہیں صنوبر کے عشق کا روگ بیمار کیے ہوئے ہے۔''

''صنوبر.....''اصغر کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی جو تحصیل دار کے بیٹے نے نہیں سنی۔

اس سے وداع لے کر وہ دوائیوں سمیت کبھی نصرت اور کبھی صنوبر کے خیالوں میں گم کمرے کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

''صنوبر تم..... یہاں..... اس وقت..... میں نے سنا تھا تمہاری شادی ہوگئی۔ تمہارے شوہر کہاں ہیں۔''

''میرے شوہر ریل کے حادثے میں فوت ہوگئے۔ساس سسر نے گھر سے نکال دیا۔اب میں بالکل اکیلی ہوں۔میرا کوئی سہارا نہیں۔''

''ایسا مت کہو۔اندر آؤ....''اصغر کی نظروں میں وہی معصومیت تھی لیکن صنوبر نے اس میں اپنے ذہن کے عناصر تلاش کر لیے۔

''میں حاملہ ہوں.....''

''حاملہ.....پھر تو تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔چلو بستر پر لیٹ جاؤ۔میں تمہارے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔''

صنوبر پلنگ پر آرام کر رہی تھی۔اس کا ذہن بار بار اپنی بدحالی کی طرف جا رہا تھا۔

''میں جہاں سے چلی تھی، وہیں پھر پہنچ گئی۔ لیکن اب اکیلی نہیں ہوں۔ یہ بچہ...... اس کی اور میری زندگی....'' یکا یک اسے اپنی ماں اور نواب تیمور جنگ کا رشتہ یاد آ گیا۔

''اصغر اب بھی مجھے چاہتا ہے۔ کنوارا بھی ہے۔ اس سے اچھا سہارا نہیں ملے گا۔''

اصغر کھانا لے کر واپس آیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد صنوبر پلنگ پر لیٹ گئی اور اصغر زمین میں اپنا بستر لگانے لگا۔ صنوبر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو۔''

''دیکھ رہی ہوں اس چہرے کی معصومیت، ان نظروں میں اپنے لیے وہی محبت۔''

اصغر اپنے بستر سے اٹھ کر صنوبر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ صنوبر نے اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیے اور اس سے لپٹ گئی۔

''تمہارے ہونٹ جل رہے ہیں، بدن بھی تپ رہا ہے..... تم نے دوا لی۔''

''ہاں لائی ہے۔ وہ رکھی ہے۔''

''تو ابھی کھا کر سو جاؤ...... کل میں اپنی نئی زندگی کے متعلق تم سے بات کروں گی۔''

اصغر صبح صنوبر اور اس کا سامان ساتھ لے کر ایک ہوٹل میں گیا۔

''مجھے آپ کے ہوٹل کا ایک کمرہ ۶۔۵ مہینوں کے لیے چاہیے۔''

''سر..... دوسو روپئے مہینے کا کمرہ مل سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے یہ لیجیے دو ماہ کا ایڈوانس۔ ۴۰۰ روپئے۔''

''آپ اپنا نام پتہ لکھوا دیجیے۔''

نام پتہ لکھوانے کے بعد اس نے چابی لی۔ بیرے نے سامان اٹھایا اور وہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''تم یہاں آرام سے رہو بچے کی ولادت ہونے تک۔ تمہارا کھانا بھی میں یہیں لے آیا کروں گا۔''

''تم کتنے اچھے ہو۔ میرا بھی تمہارے سوا کون سہارا ہے۔ اب میں تمہاری ہوں۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔''

اصغر کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اچھا اب تم آرام کرو۔ میں دوپہر میں کھانا لے کر آؤں گا۔''

دن گزرتے گئے۔ صنوبر اور نصرت کے پیٹ بھی بڑھتے گئے۔ آخر کار دونوں کو ایک ساتھ ہی نرسنگ ہوم میں داخل ہونا پڑا۔

''مبارک ہو بیٹا..... میں باپ بن گیا..... نصرت نے میرے بیٹے کو جنم دیا ہے۔''

''آپ کے بیٹے کو.....'' اصغر کے دماغ نے جھٹکا کھایا۔

''ہاں بیٹا..... اس لڑکی کا کیا ہوا جو بیوہ ہے اور تم نے اسے ہوٹل میں رکھا تھا۔''

''ایک دو دن میں اس کی بھی ڈلیوری ہو جائے گی۔''

''اچھا جب وقت ملے تو بچے کو دیکھنے ضرور آنا۔ نصرت ابھی ایک ہفتہ یہیں رہے گی۔''

صنوبر کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ وہ رو رہی تھی۔ اصغر اسے دلاسے دے رہا تھا۔ یکا یک صنوبر کے دماغ میں آیا۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ اب وہ آزاد ہے اور نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کر سکتی ہے۔

مولانا بخش اصغر کو زبردستی اپنے بیٹے کو دکھانے کے لیے لے گیا۔ نصرت نے جب اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

''دیکھو اصغر ہمارا بیٹا۔ کیوں نصرت۔''

''جی ہاں۔'' نصرت نے اصغر کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارا بیٹا۔''

صنوبر ٹھیک ہو گئی۔ اصغر نے ہوٹل چھوڑ دیا اور مولانا بخش کے یہاں اپنے ساتھ والا ایک اور کمرہ کرائے پر لے لیا اور ان کی اجازت سے صنوبر اس کمرے میں رہنے کے لیے آ گئی۔

اصغر کی صحت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔ ایک دن تحصیل دار کا بیٹا اس سے ملنے آیا۔

''ارے تمہاری طبیعت خراب ہے اور تم نے مجھے خبر تک نہیں کی۔ ارے صنوبر تم

یہاں کیسے۔اورتم یکا یک کالج سے کہاں غائب ہوگئی تھی۔''

''میں اپنے ماما کے یہاں چلی گئی تھی۔آج ہی آئی ہوں۔اصغر کی طبیعت کے بارے میں سنا تو اس کا حال چال پوچھنے چلی آئی۔اب جب تک یہ ٹھیک نہیں ہو جاتا اس کے ساتھ والے کمرے میں ہی رہوں گی۔'' صنوبر کے جھوٹ پر اصغر اور تحصیلدار کا لڑکا دونوں مسکرا دیے۔

''یار تم دوائیں وقت پر لیا کرو۔ابھی کون سی دوا لینی ہے۔''

''وہ بخار کے ساتھ ساتھ نیند والی۔''

دوا کھا کر اصغر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

''اصغر سو گیا ہے۔چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔''تحصیل دار کے بیٹے نے صنوبر سے کہا۔

''چلو۔''

دونوں ایک ہوٹل کے رستوران میں پہنچے۔

''صنوبر تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک امیر باپ کا بیٹا ہوں۔میرے والد تحصیل دار ہیں اور آئندہ میرا بھی تحصیل دار بننے کا ارادہ ہے۔''

''ہاں..... ہاں۔''

''اچھا ایک بات سچ سچ بتاؤ۔کیا تم اصغر سے پیار کرتی ہو۔''

''نہیں تو......کیوں.....؟''

''میرا بھی یہی خیال تھا ورنہ تم اسے چھوڑ کر اتنے لمبے عرصہ کے لیے نہ چلی جاتی۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔کیا تم مجھ سے شادی کروگی۔میرے پاس دولت ہے۔ خوبصورتی ہے۔تمہیں چاہنے والا دل ہے۔''

صنوبر سوچ میں پڑ گئی۔شاندار مستقبل سامنے تھا۔اسے ایک پل اصغر کا خیال آیا لیکن.....اس نے اپنا ہاتھ تحصیل دار کے بیٹے کے ہاتھ پر رکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔تحصیل دار کا بیٹا خوش ہو گیا اور اس نے صنوبر کو اپنی بانہوں میں کس لیا۔صنوبر نے بھی بہت دنوں بعد کسی مرد کے جسم کا احساس پایا تو وہ بھی بے قابو ہوگئی۔

اصغر جب سو کر اٹھا تو اس کا دوست اور صنوبر نہیں تھے۔ اس نے صنوبر کو دوسرے کمرے میں دیکھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ ہی رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مکان کے پاس نظر آئے۔ وہاں رک کر اس کے دوست نے صنوبر کے ہونٹوں پر بھرپور الوداعی بوسہ دیا اور چلا گیا۔

''ارے تم سو کر اٹھ گئے۔ اب طبیعت کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کہاں گئی تھی۔''

''وہ تمہارا دوست ہے نا، اسی کے ساتھ تھوڑا باہر کی سیر کو گئی تھی۔ سوچا اتنی دیر تم بھی آرام کر لو گے۔ تمہارا دوست بہت اچھا لڑکا ہے۔ امیر باپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اس میں گھمنڈ نہیں ہے۔''

''بات دوستی تک ہی رہی یا پھر تمہارے اور اس کے رشتے میں کچھ اضافہ بھی ہوا۔'' اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس قسم کا مذاق بالکل پسند نہیں۔ اگر تم نے مجھ پر شک کیا تو میں تمہارے دوست کے ساتھ ہی شادی کر کے تم سے دور چلی جاؤں گی۔''

اصغر معصومیت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

اصغر کی بیماری روز بہ روز بڑھتی رہی۔ ایک دن سڑک پار کرتے ہوئے وہ چکرا کر گر پڑا۔ راہگیروں نے اسے اسپتال پہنچایا۔

جب اصغر شام تک گھر نہیں آیا تو صنوبر کے دل میں عجیب عجیب خیال آنے لگے۔ انہیں کے درمیان سے یہ خیال بھی نکلا کہ موقع اچھا ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ کیوں نہ یہاں سے بھاگ جایا جائے اور تحصیل دار کے بیٹے کی ہو کر رہا جائے۔

تحصیل دار کا بیٹا دروازہ کھولتے ہی چونک پڑا۔

''ارے صنوبر تم یہاں۔''

''ہاں۔ آج اصغر نے تمہیں بہت برا بھلا کہا۔ ہمارے رشتوں پر الزام لگایا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوا اور میں اس کو چھوڑ کر تمہارے پاس چلی آئی۔''

''بہت اچھا کیا۔اب ہم ساتھ رہیں گے۔میں تین چار دن میں ہی تم سے شادی کر لوں گا۔''

''سچ۔''

''بالکل۔میں تو آج ابھی تم سے شادی کرتا لیکن دوستوں یاروں، ماں باپ کو بتانے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے۔''

صنوبر اس سے لپٹ گئی۔ وہ صنوبر کو پاگلوں کی طرح چومنے لگا۔ ہوس کی آگ تیز ہو گئی۔ دونوں طوفان میں بہہ گئے۔ جب جسم کی آگ بجھ گئی تو صنوبر نے کہا۔

''یہ ہم اچھا نہیں کر رہے ہیں۔شادی سے پہلے۔''

''میری جان شادی تو ایک رسم ہے اصل تو دل سے ماننے والی بات ہے۔سچ بتاؤ کیا تم مجھے دل سے اپنا شوہر قبول نہیں کر چکی ہو۔''

صنوبر اس کے گلے لگ گئی۔

''ہم پرسوں ہی شادی کر لیں گے۔کل تمہیں میرے ساتھ ایک پارٹی میں چلنا ہے جہاں میرے دوست بھی ہوں گے۔ وہاں سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور شادی میں شرکت کے لیے سب کو دعوت بھی دے دیں گے۔''

پارٹی بہت شاندار تھی.....دس آدمی لیکن کوئی لڑکی نہیں۔صنوبر اکیلی لڑکی تھی جو اصغر کے ساتھ تھی۔ اصغر نے سب کو اس سے ملایا۔شادی کی دعوت دی۔ اس پر ایک دوست نے خوش ہو کر کہا۔

''یار تو بہت خوش قسمت ہے کہ جنت کی حور تری آغوش میں ہے۔کاش ہمیں بھی ایسی ہی حور ملتی۔چل اسی خوشی میں دو گھونٹ مار لے اور بھابھی کو بھی دو گھونٹ پلا۔''

نہ.....نہ.....کرتے کرتے بھی زبردستی صنوبر کے منہ میں جام کے قطرے ڈال دیے گئے۔اس پر نشہ طاری ہو گیا۔

''چلو بھائی مال تیار ہے۔اب دھن نکالو۔''

سب لوگ اس کو پیسے دینے لگے۔اس کے بعد آپس میں تکرار ہونے لگی۔

''پہلے میں جاؤں گا۔ میں نے تین ہزار دیے ہیں۔''

''نہیں سب سے پہلے میں جاؤں گا۔ میں نے سب سے زیادہ پانچ ہزار دیے ہیں۔''

پانچ ہزار والا سرور میں ڈوبی صنوبر کو اٹھا کر ایک کمرے میں لے گیا۔ باقی اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ تحصیل دار کا بیٹا نوٹ گننے میں مصروف تھا۔

جب صنوبر کا نشہ ٹوٹا تو اس نے خود کو ایک نیم اندھیری کوٹھری میں برہنہ پایا۔ جسم کا ایک ایک عضو ٹوٹ رہا تھا۔ پورا واقعہ یاد کر کے وہ زار و قطار رونے لگی۔ خوب رو کر جی ہلکا کرنے کے بعد وہ تڑپتی ہوئی اٹھی اور کسی طرح کپڑے پہنے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ دروازے تک آئی ہی تھی کہ مولانا بخش اس کے سامنے آ گیا۔

''آپ۔''

''ہاں میں، اب تم یہاں سے نہیں جاسکتی۔''

''کیوں۔''

''تمہیں میں نے خرید لیا ہے۔ اب تم یہیں رہوگی اور میرے گراہکوں کو خوش کروگی۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ماری جاؤ گی۔ زندہ رہنا ہے تو اس چکلا گھر کو چلاتی رہو۔''

''چکلا گھر۔ آپ چکلا چلاتے ہیں۔''

''ہاں۔ لیکن یہ بات کوئی نہیں جانتا اور جس نے جاننے کے بعد دوسرے کو بتانے کی کوشش کی، وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔''

مولانا بخش کا یہ روپ صنوبر نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا۔ وہ خوف کے مارے پیچھے ہٹ گئی۔

(۹)

اصغر کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال کے نرم بستر پر پایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

''آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ بہت کمزوری ہے۔ کچھ دن ٹھیک ہونے میں لگیں گے۔ تب تک آپ کو یہیں رہنا پڑے گا۔ ہاں صحت جلدی اچھی ہو جائے اس کے لیے روز صبح سمندر کنارے سیر کو ضرور جائیں تا کہ تازہ ہوا آپ کو فائدہ پہنچائے۔''

اصغر صبح سیر کو جانے لگا۔ طبیعت ٹھیک ہو رہی تھی۔ ایک دن وہ سیر کر رہا تھا کہ ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے قدموں پر گر پڑی۔

''مجھے بچالو، مجھے بچالو۔''

اصغر چونک پڑا۔ آواز مانوس تھی۔ اس نے جب اس کا چہرا دیکھا تو ہوش گم ہو گئے۔ صنوبر سے اس طرح ملنے کی اسے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ صنوبر نے جب اسے دیکھا تو بھاگنے لگی۔

''صنوبر تمہارا یہ حال...... کیسے۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''مجھے مولانا بخش سے بچاؤ۔ وہ میرے پیچھے آرہا ہے۔ وہ چکلا چلاتا ہے۔ لڑکیوں کو خریدتا اور بیچتا ہے۔ آج بڑی مشکل سے میں اس کی قید سے بھاگ نکلی لیکن وہ پیچھے آرہا ہے۔ مجھے بچالو، وہ بہت بڑا غنڈہ ہے۔''

اصغر کا سر چکرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ پاتا مولانا بخش وہاں آ گیا۔

''اصغر تم..... اچھا تو اس نے میری اصلیت تمہیں بتادی۔ میں نے اس کو خریدا ہے۔ اس کو میرے حوالے کر دو اور تم بغیر کسی کو کچھ بتائے اس شہر سے چلے جاؤ ورنہ مجبوراً مجھے تمہارا خون کرنا پڑے گا۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں بہت خطرناک غنڈہ ہوں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں۔ مجبور لڑکیوں کے جسموں کی دلالی کرنے والے دلال، بہت بڑا غنڈہ ہے تو۔ بڑی مردانگی کا کام کر رہا ہے۔ کمینے بھاگ جا یہاں سے۔''

مولانا بخش نے چاقو نکال لیا۔

''مردانگی تو تو نے میری دیکھی ہی ہے۔ اس بڑھاپے میں میں نے لڑکا پیدا کر کے دکھا دیا۔ میں کتنا بڑا اور خطرناک غنڈہ ہوں، یہ میں ابھی تجھے قتل کر کے ثابت کر دوں گا۔''

اصغر کا خون جوش مارنے لگا۔

''اپنا چاقو موڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے۔ گھر جا کر اپنی بیوی کو دے دینا۔ وہ اس سے سبزی کاٹے گی اور رہی مردانگی کی بات تو چاقو دیتے وقت اس سے یہ بھی پوچھ لینا کہ وہ بچہ کس کا ہے۔ تیرا ہے یا اصغر کا۔''

''کیا..... تو جھوٹ بولتا ہے۔ میری پارسا بیوی پر الزام لگاتا ہے..... میں...... میں..... تجھے۔'' مولانا بخش کا ہاتھ لرزنے لگا۔ صنوبر حیرانی سے اصغر کو دیکھ رہی تھی۔

''مجبور عورتوں کے جسموں کی دلالی کھانے والے دلّے۔ جا اپنی بیوی سے پوچھ۔ میں صنوبر کو لے کر وہیں آتا ہوں۔''

مولانا بخش غصے میں نصرت کے پاس پہنچا اور اس کے گلے پر چاقو رکھ دیا۔

''سچ بتا نصرت۔ یہ بچہ کس کا ہے۔ میرا یا اصغر کا۔ اگر مجھے لگا کہ تو جھوٹ بول رہی ہے تو یہ چاقو ترے جسم کے آر پار کر دوں گا۔ سچ سچ بتا۔''

نصرت نے اس بوڑھے کو اس خطرناک روپ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ جھوٹ نہ بول سکی۔

''اصغر.....کا۔''

مولانا بخش یہ سن کر پاگل ہو گیا اور نصرت کے پیٹ کو رامپوری چاقو سے چیر ڈالا۔ اس نے بچے کو بھی نہیں بخشا۔ پولیس نے ان دونوں کے خون کے الزام میں اسے گرفتار کر لیا۔

(۱۰)

اصغر صنوبر کو لے کر مولانا بخش کے گھر اپنے کمرے میں آیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور صنوبر کو لے کر دوسری جگہ کرائے کا کمرہ لے کر رہنے لگا۔ صنوبر اب اس سے سچا پیار کرتی تھی۔ وہ اسے پانا چاہتی تھی لیکن اصغر کے چہرے پر وہی معصوم شرافت تھی۔ صنوبر کے اب تک رویے نے اس سے پیار کرنے کی قوت چھین لی تھی۔ عجب انتشار اس کے دل و دماغ میں گھر کر گیا تھا۔ نہ وہ صنوبر سے دور رہ سکتا تھا نہ اس کے قریب جا سکتا تھا۔ صنوبر بھی اس کی اس کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ اصغر کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ صنوبر کو لگا کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ ابھی جوان تھی، خوبصورت تھی۔ ممکن تھا کہ کچھ دن کی جدوجہد کے بعد اس کی زندگی سنور جائے۔

ایک دن اصغر صبح اٹھا تو اس نے گھر میں صنوبر کو نہیں پایا۔ وہ اسے ڈھونڈنے نکلا۔ سارا شہر چھان مارا لیکن وہ نہیں ملی۔ صبح سے شام ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں ایک دانہ نہیں گیا تھا۔ اس سبب سے اس پر غشی طاری ہوئی اور وہ گر پڑا۔

''یہ تو وہی مریض ہے جو سمندر کی سیر کرنے گیا تو واپس ہی نہیں آیا تھا۔'' ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو مسٹر میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اپنی صحت کا خیال رکھو، لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ تم پر تپیدق کے مرض نے حملہ کیا ہے۔ اب تم کو زیادہ دن تک اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ اور زیادہ سے زیادہ اپنی صحت کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

صنوبر نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''ماں جی کوئی کام مل سکتا ہے۔ میں بہت دکھیاری ہوں۔ کوئی بھی کام مل جائے میں کروں گی۔ مجھے صرف دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔''

''نہیں بھائی کوئی کام نہیں ہے۔ چلو جاؤ یہاں سے۔''

اس طرح سینکڑوں دروازوں پر اس نے دستک دی لیکن کہیں کام نہ ملا۔ آخر کار ایک دروازے پر کمزوری سے گر پڑی۔ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا اور اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔

''بابو جی کوئی کام دے دیجیے۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بہت بھوک لگی ہے۔''

وہ صنوبر کو اندر لے گیا اور کچن سے کھانا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ جب اس کے پیٹ کی آگ بجھ گئی تو اسے کچھ آرام محسوس ہوا۔ وہ آرام کرنے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ نوجوان کی انگلیاں اس کے بدن کے نازک اعضا سے کھیلنے لگیں۔

''یہ کیا کر رہے ہیں بابو جی۔''

''میری جان، میں نے تمہارے پیٹ کی آگ بجھائی۔ تم میرے پیٹ کے نیچے کی آگ بجھادو۔''

یہ کہہ کر نوجوان اس کے جسم پر زبردستی سوار ہو گیا۔ صنوبر کے اندر بھی احتجاج کی سکت نہ تھی۔ جب جوش ٹھنڈا ہوا تو اس نے صنوبر کو ۵ روپے دیے اور گھر سے چلتا کر دیا۔ رات ہو گئی تھی۔ صنوبر فٹ پاتھ پر بھکاریوں کے پاس سو گئی۔ رات کے دو بجے جب سڑک بالکل سنسان تھی اور وہ گہری نیند میں سو رہی تھی تو کئی بھکاری ایک ساتھ آئے اور اس کا منھ ہاتھ اور پیر اتنی مضبوطی سے دبایا کہ وہ ہل بھی نہ سکی۔ سب نے باری باری اس کے جسم کے سمندر میں غوطہ لگایا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے کسی سے کہا تو وہ اس فٹ پاتھ پر بھی نہیں رہ سکے گی۔ صنوبر ڈر گئی۔ اب یہ روزانہ کا معمول ہو گیا تھا کہ دن میں وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گراہک تلاشتی اور رات میں فٹ پاتھ پر سونے کے عوض اپنا جسم ان درندوں کے حوالے کرتی جو اسے بھیڑیوں کی طرح نوچتے۔ اس معمول کو بیتے ابھی ۱۵ دن ہی ہوئے تھے کہ اس کی خوبصورتی بدصورتی میں بدل گئی۔ اب کوئی گراہک اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ لیکن رات کو فٹ پاتھ پر بھکاری اسے ضرور نوچتے تھے۔ آخر کار وہ بھی ان میں شامل ہو گئی اور بھیک مانگنے لگی۔ ایک دن بھیک مانگتے مانگتے وہ سڑک پار کر رہی تھی کہ اس کا سر چکرایا اور گر پڑی۔ اتنے میں ایک گاڑی

اس کے جسم کے اوپر سے گزر گئی۔

(۱۱)

''کیا بات ہے نرس۔ یہ اسپتال میں انتشار کیوں پھیلا ہوا ہے۔''

''وہ ایک بھکارن گاڑی کے نیچے آگئی ہے۔ بے چاری کے سینے کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ کچھ ہی دیر کی مہمان ہے، اس لیے اسپتال کے لوگ ہمدردی میں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے آ، جا رہے ہیں۔''

''تب تو مجھے بھی جانا چاہیے۔''

وہ اٹھا اور بھکارن کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچا۔ پورا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں چادر سے باہر تھیں۔ اصغران آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ یکا یک اس نے چادر چہرے سے ہٹادی۔

''صنوبر تمہارا یہ حال۔ تم بھکارن.....اوہ یہ کیا ہو گیا۔''

صنوبر نیم مردہ تھی لیکن اصغر کی آواز نے اس میں جیسے زندگی پیدا کردی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''اصغر.....'' اس کے لب بری طرح کانپ رہے تھے۔

''میں نے رانی بننے کا خواب دیکھا۔ اس کے لیے مکروفریب سے کام لیا اور دیکھو اس کا نتیجہ.....کارل مارکس کے فلسفوں میں زندگی تلاش کرنے والی کالج کی طلبہ آج بھکارن بن گئی۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ کاش میں گرنے سے پہلے سنبھل جاتی۔ مجھے معاف کردو۔''

''نہیں نہیں کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ ڈاکٹر......''

اس کی چیخ میں اتنی شدت تھی کہ اسپتال کے درودیوار ہل گئے۔ ڈاکٹر اور نرس بھاگتے ہوئے آئے۔

''ڈاکٹر میری صنوبر کو...... کہتے کہتے اصغر کے منہ سے سرخ فوارہ پھوٹ پڑا۔

نرس نے اسے سنبھالا۔ ڈاکٹر نے صنوبر کا معائنہ کیا۔ وہ اس دنیا سے جا چکی تھی۔

اصغر اس کی قبر سے لپٹ کر روتا رہا۔ اس کی دنیا ویران ہو گئی تھی۔ شہر نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کیا اور چپ چاپ اسپتال سے نکل کر گاؤں جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ صحت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کھانسی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

گاڑی جب بیلا گاؤں رکی تو وہ اتر گیا۔ گرتے پڑتے اپنے گھر پہنچا۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے پہچان لیا اور اس کو لڑکھڑاتے بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ گھر کی دہلیز تک آتے آتے اس کے منہ سے ایسا سرخ فوارہ چھوٹا جس نے اسے بے دم کر دیا۔ وہ گر پڑا اور وہیں تڑپنے لگا۔ موت کے فرشتے نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز کو چوم سکتا۔

قحط

(۱)

ارشد آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ اکبر نے کھیت میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کاکا، بارش ہوسکتی ہے۔''

ارشد اور اکبر کی عمر میں کوئی خاص فرق نہیں تھا لیکن ارشد کی گاؤں میں بڑی عزت تھی اور اس لیے احتراماً اسے تقریباً تمام ہم عمر ''کاکا'' کہتے تھے۔

''انشاء اللہ بارش ہوگی۔''

''جب بارش ہوگی تو فصل اچھی ہوگی لیکن خون ہم بہائیں، دعاؤں کے لیے ہاتھ ہم اٹھائیں، اپنے پسینے کو خون بنا کر کھیتوں کو ہم سینچیں اور جب فصل ہو تو جاگیردار اپنے گھوڑے پر ڈنڈے برساتا ہوا آئے اور ہماری محنت سے پیدا کیے ہوئے اناج سے تین چوتھائی لے جائے، یہ کہاں کا انصاف ہے۔''

''اکبر ہر زمانے میں امیر ہمارے سر پر رہا ہے۔ کبھی جاگیردار کی صورت میں، کبھی زمیندار کی صورت میں، کبھی کسی اور صورت میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایسا انقلاب آنا چاہیے جس سے امیری اور غریبی کا فرق مٹ جائے۔ دراصل امیر ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن امیرانہ

ذہنیت بری شئے ہے جو اپنے جیسے مفلس انسانوں کو انسان نہیں سمجھتی بلکہ انہیں اپنا غلام سمجھتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے اور جاگیردار صاحب کے تعلقات کیسے چل رہے ہیں۔''

''کیا بتاؤں کاکا، جاگیردار صاحب سے گزارش کی تھی کہ میری تنخواہ بڑھا دیجیے۔ لیکن انہوں نے الٹے مجھے ہی چار باتیں سنا دیں۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ تمہارا بیٹا انور کیسا ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔''

''ارے وہ تو تمہارے بیٹے کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا ہے۔ سچ بتاؤں دوست تو رضیہ کے مرنے کے بعد میری زندگی کا بس انور ہی ایک سہارا رہ گیا ہے۔ یہی آس ہے کہ ایک دن اس کا ستارہ چمکے گا اور میں اس کی روشنی میں زندگی کے الجھے ہوئے پلوں کو سلجھاؤں گا۔''

''ہاں اکبر۔ میں نے بھی یہی امید اپنے بیٹے جاوید سے باندھی ہے۔ اس کی ماں اس کو بڑا آدمی بنانا چاہتی ہے۔ دیکھتے ہیں، یہ ہاتھ کب تک ساتھ دیتے ہیں۔''

اتنے میں جاوید اور انور ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے دکھائی دیے۔

''کہاں جا رہے ہو بچوں۔''

''ہم جاگیردار پارک کھیلنے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن جلدی لوٹ آنا۔''

''جی اچھا۔''

جاگیردار پارک میں جاگیردار کی چھوٹی سی پری جیسی بیٹی نسرین بھی کھیل رہی تھی۔

''ارے جاوید اور انور تم آ گئے۔ چلو کھیلتے ہیں۔''

جاوید نے کہا۔

''لیکن نسرین تمہیں تو انور کے ساتھ کھیلنا زیادہ پسند ہے۔ مجھے کھیل کے بیچ میں چھوڑ کر تم اور انور اتنے مگن ہو جاتے ہو کہ مجھے لگتا ہے میں کھیل میں ہوں ہی نہیں۔''

(۲)

کھیتوں کی رانی اپنے بچوں پر مہربان تھی۔ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ شاید اس سال قدرت کو رحم آ گیا تھا۔ پچھلے سال کے قحط نے کسانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اس فصل نے ان کو زندگی کی کچھ آس بندھائی۔

جاگیردار گھوڑے پر سوار چابک لہراتے ہوئے اپنا حصہ وصول کرنے نکلا۔ ارشد کے کھیت پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''فصل تو کافی اچھی ہوئی ہے کاکا۔''

''جی جاگیردار صاحب۔''

''کاکا۔ تم نے مجھ سے کچھ روپئے قرض لیے تھے۔''

''جی ہاں جاگیردار صاحب۔ چالیس روپئے لیے تھے۔''

''اس چالیس روپیوں کی شالی چھوڑ دینا۔''

''جاگیردار صاحب میں وہ روپئے آپ کو نقد لوٹا دوں گا۔''

''کیسے؟''

''منڈی میں فصل فروخت کر کے۔''

''اچھا تو اب فصل منڈی میں فروخت ہوگی۔ لیکن کاکا میں تو تب تک انتظار نہیں کر سکتا۔''

''اس سے پہلے کہاں ممکن ہے جاگیردار صاحب۔''

جاگیردار کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ لیکن اس نے اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

''ممکن نہیں ہے تو کیوں نہیں چالیس روپۓ کا اناج دے کر حساب ختم کر دیتے۔''

''دراصل جاگیردار صاحب یہاں جتنا اناج آپ کو چالیس روپۓ کے عوض دینا پڑے گا، اتنا منڈی میں فروخت کرنے پر اسی روپۓ تک مل جائیں گے۔ اور اس طرح میرا چالیس روپۓ کا نقصان ہو جائے گا جو کہ میرے لیے بڑی رقم ہے۔ آپ کچھ دن رک جائیے۔ آپ کے پاس کیا کمی ہے۔''

''ہماری کمی بیسی کا حساب تم مت لگاؤ کاکا۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں۔'' جاگیردار کا لہجہ تلخ تھا۔

''لیکن جاگیردار صاحب۔ ہماری چھوٹی چھوٹی حیثیتوں نے ہی تو آپ کو اس حیثیت کا بنایا ہے کہ آپ کے سامنے ہماری حیثیت کچھ بھی نہیں۔''

''زبان کو لگام دو کاکا۔'' جاگیردار آپے سے باہر ہو گیا۔ ''تم نے مجھ سے اناج اگانے کے لیے روپۓ لیے تھے۔ اس لیے میں اناج ہی لوں گا۔''

''جاگیردار صاحب یہ جو فصل ہے، پوری فصل کی قیمت ہی ۱۳۰۔۱۲۰ روپۓ ہو گی۔ اگر اس میں سے منڈی کی قیمت کے اعتبار سے ۸۰ روپۓ کی فصل آپ کو دے دوں گا تو میرے پاس اگلی فصل تک کچھ بھی نہیں بچے گا۔ میرے گھر کے لوگ بھوکے مر جائیں گے۔ یا پھر مجھے ان کو زندہ رکھنے کے لیے آپ سے دوبارہ قرض لینا پڑے گا۔''

''تمہارے گھر والوں کا ذمہ میں نے نہیں لیا۔ وہ مرتے ہیں تو میں کیا کروں۔ مجھے چالیس روپۓ کی شالی دے دو ورنہ.....''

''حد سے آگے مت بڑھیۓ جاگیردار صاحب۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب جب کسانوں پر ظلم حد سے بڑھا ہے، ان کے صبر کا باندھ ٹوٹا ہے اور جاگیرداروں کی نسلوں کی نسلیں ختم ہو گئی ہیں۔ منڈی میں اناج بیچتے ہی سب سے پہلے آپ کے چالیس روپۓ لوٹاؤں گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔''

اتنی دیر کی گفتگو سے آس پاس کے کسان بھی جمع ہو گئے تھے۔ جاگیردار نے ماحول کا اندازہ لگایا اور اپنے گھوڑے کو تیز دوڑاتے ہوئے وہاں سے ہوا ہو گیا۔

''اجمل کو بلاؤ۔''

''جی جاگیردار صاحب۔''

اجمل جب ہال میں داخل ہوا تو جاگیردار صاحب کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پایا۔

''جی مالک۔''

''تمہیں اتنی رات گئے اس لیے بلایا ہے اجمل کہ اسی وقت اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرو اور چپ چاپ جا کر ارشد کے گھر میں آگ لگا دو۔ کسی کو کان و کان خبر نہ ہو۔''

''کاکا کے گھر میں آگ...... مگر وہ تو بڑا شریف آدمی ہے مالک۔'' اس نے کہا۔

''اجمل اگر اس قسم کے شریف لوگ سر اٹھانے لگے تو ہماری جاگیرداری نہیں رہے گی اور جب ہماری جاگیرداری نہیں رہے گی تو تمہاری غنڈہ گردی کس کام کی۔ تمہیں بھی کسانوں کی طرح خون پسینہ بہا کر بھی دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کیا تم یہی چاہتے ہو۔''

''نہ نہ.... نہیں مالک۔''

''تو پھر جو کہا ہے، کرو۔''

یہ سب باتیں اکبر دروازے کے پیچھے سے سن رہا تھا۔ وہ اپنے دوست ارشد کو ہشیار کرنے کے لیے بھاگا۔

''ارے اکبر۔ رات کے ایک بجے تم یہاں۔ کیا بات ہے۔ اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔''

''جاگیردار نے....... جاگیردار نے اجمل غنڈے کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ تمہارا گھر جلانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ تم اپنے بال بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔''

''کیا..... اس کمینے کی یہ جرأت۔ مجھے بزدل سمجھتا ہے۔ میں ابھی گاؤں والوں کو اکٹھا کرتا ہوں اور اجمل اور اس کے غنڈوں کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہوں۔''

''اتنا وقت نہیں ہے میرے دوست۔ تمہارا گھر بستی سے دور ہے۔ یہاں سے تو تمہاری آواز بھی بستی تک نہیں پہنچے گی اور ہم بستی جا بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ لوگ بستی سے آگے

تمہارے گھر کی طرف آ چکے ہوں گے۔"

"لیکن میں بزدلوں کی طرح یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ بھلے مجھے کچھ بھی ہو جائے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن بھابھی اور بچے کو یہاں سے فوراً نکالو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا۔"

"نہیں اکبر۔ میرے دوست، تم رقیہ اور بچے کو لے کر یہاں سے دس میل دور سندر بنی میں بہ حفاظت چھوڑ کر آؤ۔ وہاں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ میری مدد کے لیے آ گئے تو اچھا ہے۔ تب تک میں انہیں روکتا ہوں۔"

رقیہ نے احتجاج کیا۔ "نہیں میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ جاوید کو اکبر کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔"

"نہیں تمہارا جاوید کے ساتھ جانا ضروری ہے۔ تمہیں میری اور جاوید کی قسم۔ اب دیر نہ کرو۔ اکبر انہیں یہاں سے لے جاؤ۔"

جاوید بھی والد کے پیروں سے لپٹ گیا۔ لیکن اکبر تقریباً اسے کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ سب ارشد کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ارشد اجمل اور اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔

(۳)

''ارشد کے گھر میں بالکل خاموشی ہے۔ لگتا ہے سب سو رہے ہیں۔ چاروں طرف سے گھر میں آگ لگا دو۔ پورا گھر سوتے سوتے ہی جنت پہنچ جائے گا اور گاؤں والے سمجھیں گے کہ حادثے میں پورا گھر راکھ ہو گیا۔''

''کس کی مجال ہے جو میرے گھر میں آگ لگائے۔'' ارشد کی رعب دار آواز اندھیرے میں گونجی۔

''ارے یہ تو جاگ رہا ہے۔ چلو ساتھیو! تم سب ایک ساتھ کاکا پر ٹوٹ پڑو۔ میں اس کے گھر کو آگ لگاتا ہوں۔''

اجمل کے ساتھی لاٹھی، ڈنڈوں اور تلواروں سے لیس تھے۔ ارشد کے پاس صرف ایک لاٹھی تھی۔ لیکن وہ بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے لگا۔ لیکن صرف لاٹھی بھلا لوہے کے ہتھیاروں کا مقابلہ کہاں تک کرتی۔ ارشد کو چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ لیا گیا اور اسے پیٹا جانے لگا۔ ادھر گھر جلا دینے کے سبب آگ کے شعلے فضا میں اٹھتے ہوئے دیکھ کر گاؤں کے لوگ شور مچاتے ہوئے اس طرف دوڑے۔ یکا یک لوگوں کا ہجوم اپنی جانب آتے دیکھ کر اجمل اور اس کے ساتھی گھبرا گئے اور ایک دوسرے کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی توجہ اپنی طرف نہ پا کر ارشد نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور تیزی سے جنگل میں بھاگ گیا۔ اجمل اور اس کے ساتھی بھی دوسری طرف سے بھاگ نکلے۔ ارشد ایک میل جنگل کو پار کر کے پہاڑی کے نیچے والی سڑک پر آ گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اسے ایک بیل گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔

''گاڑی وان۔ مجھے سندر بنی جانا ہے۔''

''بابورات کے ڈھائی بجے ہیں۔ ابھی کون جائے گا۔ صبح چلیں گے۔''

''میرے پاس دس روپئے ہیں۔ وہ سب تمہارے۔''

''اچھا بیٹھ جاؤ۔''

ارشد شدید زخمی تھا۔ اس لیے نیم بے ہوشی میں ڈوب گیا۔

''بابو.....او بابو.....اٹھو.....سندر بنی آ گیا۔''

''آں.....آ گیا.....یہ لو.....دس روپئے۔''

وہ لڑکھڑاتے ہوئے اترا اور اپنے رشتہ دار کے گھر کی جانب چل پڑا۔ اس کی بیوی اور دوست دروازے کے باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ غش کھا کر گرنے ہی والا تھا کہ اکبر نے اسے اپنی بانہوں میں سنبھال کر نیچے لٹایا۔

''گھبراؤ نہیں کاکا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں ابھی وید کو لے کر آتا ہوں۔''

''نہیں دوست میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں اسے دھیان سے سنو اور وعدہ کرو کہ پورا کرو گے۔''

''تم کہو تو۔''

''پہلی بات تو یہ کہ تم گاؤں میں کسی سے نہیں کہو گے کہ میرا گھر جلانے کا سبب کیا تھا۔ گاؤں والوں نے آگ کے شعلے دیکھے تو گھر کی اور دوڑے تھے۔ شاید گاؤں میں یہ خبر پھیلے کہ یکایک میرے گھر میں آگ لگ گئی اور میں اسی میں جل گیا۔ تم جب گاؤں جانا تو یہی بتانا کہ بیوی بچے کو بچاتے بچاتے ارشد خود آگ کی لپٹوں میں گھر گیا اور زندہ نہ نکل سکا۔ تم میرے کھیت پر حل چلاؤ گے۔ میری زمین جائداد تم سنبھالو گے۔ دوسری بات یہ کہ میرے بعد تم رقیہ سے نکاح کر لو گے۔ تم جانتے ہو یہ دنیا کتنی ظالم ہے، وہ اکیلے یتیم بچے کے ساتھ عزت و آبرو کے ساتھ نہیں رہ سکے گی۔ وعدہ کرو.....وعدہ کرو.....''

اکبر کے کچھ بولنے سے پہلے رقیہ بول پڑی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے آپ کی بیوہ ہونا منظور ہے لیکن کسی اور کی بیوی بننا نہیں۔''

''ہاں یار میں ایسے بھی بھابھی اور بچے کا پورا خیال رکھوں گا۔''

''نہیں.....نہیں..... جب گاؤں والے تم سے پوچھیں گے کہ تمہارا رشتہ کیا ہے تو تمہارے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوں گے۔طرح طرح کی باتیں ہوں گی.....تم دونوں وعدہ کرو..... وعدہ کرو۔ میری سانس رک رہی ہے۔تم دونوں اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو..... جلدی.....''

ان دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔اس نے ان دونوں کے ہاتھوں کو ملا دیا اور اسی وقت اس کی روح پرواز کرگئی۔

(۴)

اکبراور رقیہ کی شادی ہوگئی۔اب جاویداورانور ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔رقیہ نے ارشد کی ساری جائداد فروخت کردی۔اکبر نے بھی یہی کیا۔انہوں نے کسی کو پورے واقعے کی خبر نہ ہونے دی اور پھر سندر بنی میں ہی رہنے لگے۔یہاں اکبر نے ایک چھوٹی سی میوے کی دوکان کھولی۔انور اکثر جاگیردار کی بیٹی کی کمی کو محسوس کرتا تھا۔جب بھی جاویداور انور کھیلتے انور کو جاگیردار کی بیتی یاد آجاتی۔

رقیہ کو بچہ ہونے والا تھا،اسی لیے وہ چڑچڑی ہوگئی تھی۔بات بات پر دونوں بچوں کو ڈانٹتی۔اکبر بھی رقیہ اور ہونے والے بچے کے پیار میں اس قدر دیوانہ ہوگیا تھا کہ بچوں کی جانب اس کی توجہ بھی کم ہوگئی تھی۔وہ ہر چیز اپنی بیوی کی آنکھ سے ہی دیکھنے لگا تھا۔رقیہ کو بیٹا ہوا۔اکبراور رقیہ کا بیٹا۔اس کی محبت میں اکبر اپنی بیوی کے بچے اور رقیہ اپنے شوہر کے بچے کو بھول چکے تھے۔ایک دن تو حد ہوگئی۔دونوں منا کو کھلا رہے تھے کہ منا رونے لگا۔

''کیا اسے مار ڈالوگے۔''اکبر نے دونوں کو ڈانٹا۔

''ہاں ہاں مار ہی ڈالیں گے۔دونوں سوتیلے ہیں نا۔''رقیہ نے یہ کہتے ہوئے دونوں کے گال پر ایک ایک تھپڑ جڑ دیا۔

دونوں کے جملوں نے جاویداور انور کے معصوم دلوں میں آگ لگادی اور رقیہ کے تھپڑ نے آگ میں گھی کا کام کیا۔دونوں ریلوے اسٹیشن آگئے اور ایک ریل میں سوار ہوگئے۔ریل چل پڑی۔کچھ دیر بعد جاوید کو بھوک لگی۔انور کے پاس کچھ پیسے تھے۔گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی اور اسے چنے والا دکھائی پڑا۔انور چنے خرید ہی رہا تھا کہ ریل چل پڑی۔پلیٹ فارم پر ٹی.ٹی.ٹہل رہا تھا۔دونوں کی نظر اس پر پڑی اور دونوں خاموش رہ گئے۔جاوید ریل کے ساتھ چلا

گیا اور انور پلیٹ فارم پر دیکھتا رہ گیا۔

''ارے بیٹا تم یہاں۔''

''رحمت چاچا آپ۔''

''ہاں۔اب میں یہیں رہتا ہوں۔لیکن تم.....''

''ہم نے ماں باپ کے ظلم سے تنگ آکر گھر چھوڑ دیا ہے۔جاوید ریل کے ساتھ چلا گیا۔''

''ارے تمہارے ماں باپ پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''نہیں چاچا میں وہاں نہیں جاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے تم میرے ساتھ رہنا۔چلو میرے گھر۔''

ریل اپنے آخری اسٹیشن پر رکی۔جاوید نے پاس کے آدمی سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے۔''

''یہ گلاب نگر ہے۔یہ ٹرین اس کے آگے نہیں جائے گی۔تمہیں کہاں جانا ہے۔''

''مجھے.....مجھے بھی یہیں اترنا ہے۔''

اس کی جیب میں ایک آنہ تھا۔اس سے اس نے پیٹ کی آگ بجھائی اور کچھ دیر ادھر ادھر گھومتا رہا۔رات ہوگئی تو سڑک کے کنارے ایک جگہ سو گیا۔آدھی رات کو کسی نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

''اٹھ بے.....کیا باپ کا پھٹ پاتھ سمجھ رکھا ہے۔''

''کیا ہوا جناب۔''

''جناب.....ابے مجھے یہاں لوگ استاد بولتے ہیں۔لگتا ہے باہر سے آیا ہے۔یہاں کیوں سو رہا تھا۔''

''خالی جگہ تھی۔آس پاس اور لوگ بھی سوئے ہیں تو میں بھی یہیں سو گیا۔''

''تجھے معلوم ہے یہاں سونے کا کرایہ لگتا ہے۔چل نکال دو آنے۔''

''دو آنے....ابھی تو میرے پاس ایک بھی پیسہ نہیں ہے۔کل دے دوں گا استاد۔''

''استاد......واہ تیری یہ ادا پسند آئی۔لیکن کل کہاں سے دے گا بے للو۔''

''کل کوئی کام ڈھونڈ لوں گا اور آپ کو پیسے دے دوں گا۔''

''کام..... ہاہاہا....ابے کام کر کے بھی کوئی آج تک پیسہ کما پایا ہے جو تو کمائے گا۔ ابے زندگی اسی فٹ پاتھ پہ ایڑی رگڑتے گزر جائے گی۔ مجھے دیکھ میں بی۔اے۔ پاس ہوں۔ جب مجھے نوکری نہیں ملی تو مجبوری میں دادا بننا پڑا۔ محنت مزدوری سے تو کیا کھائے گا اور کیا بچائے گا..... بات کرتا ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں استاد۔''

''چل آجا میرے ساتھ۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ دنیا کی گردن پر پاؤں رکھ کر کس طرح جیا جاتا ہے۔''

''استاد یہ تو چوری ہے.....میں یہ کام......''

''ابے دنیا میں کون چور نہیں ہے..... بیٹا یہی ایک راستہ ہے جس سے اچھی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔''

''نہیں استاد.....کوئی محنت کا کام ہو تو دے دو.....''

''ابے تو کیا سمجھتا ہے۔چوری کرنے میں محنت نہیں لگتی۔''

''نہیں استاد میرا ضمیر نہیں مانتا۔ میں محنت مزدوری کر کے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''تو مر سالے۔ جا چلا جا یہاں سے۔ جب ضمیر مر جائے تو استاد کو یاد کرتے ہوئے آجانا۔ چل بھاگ یہاں سے۔''

جاوید کافی دور چلتا رہا۔ آخر کار بھوک سے نڈھال ہو کر ایک جھونپڑی کے آگے غش کھا کر گر گیا۔

''میں کہاں ہوں.....تم کون ہو ماں۔''

''ماں......ارے مجھے ماں مت کہو۔ میں بڑی ابھاگن ہوں.....تم لیٹے رہو تمہیں تیز بخار تھا۔ابھی ابھی اترا ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

بوڑھی کے آنسوؤں سے جاوید کا چہرا بھیگ گیا۔ وہ اسے حیران نگاہوں سے دیکھ رہا

تھا۔ بوڑھی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں بھی جینے کی تمنا جاگ اٹھی۔

(۵)

حکیم نے مریض کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''گہرا صدمہ لگا ہے شاید۔ دوا دے دیتا ہوں لیکن ..... آپ اپنی بیوی کے پاس ہی رہیے ...... خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں چلتا ہوں۔''

حکیم کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اکبر سمجھ گیا۔ وہ حکیم کو دروازے تک چھوڑ کر واپس آیا۔

''سب اپنی کرنی کا پھل ہے۔ کسے خبر تھی کہ دونوں معصوم بچوں کی آہیں ہمیں برباد کر دیں گی۔ کاروبار بیٹھ گیا۔ رقیہ ایسی بیمار پڑی کہ بس ..... بسا بسایا گھر اجڑ گیا۔'' اکبر بڑبڑاتے ہوئے واپس رقیہ کے پاس آیا۔

''میرا بچہ آ گیا۔''

''تم ٹھیک ہو جاؤ۔ ہم بچوں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''میں تمہارے نہیں اپنے بچے کی بات کر رہی ہوں۔ کیا میں نے ان دونوں پر ..... اپنے تن سے جنے ہوئے بچے پر اتنا ظلم کیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ دونوں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔'' رقیہ پتہ نہیں کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔ اکبر سر جھکائے سنتا رہا۔ یکا یک رقیہ کی آواز ڈوبنے لگی۔

''میرا بیٹا مجھے بلا رہا ہے ..... میں ..... جا رہی ہوں .....'' اور رقیہ چلی گئی۔ اکبر چیختا ہی رہ گیا۔ تدفین کو دو دن گزر گئے۔ وہ اپنے معصوم بیٹے کے لیے بیزاری کی زندگی جینے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن میں وہ اپنے بیٹے کو دودھ پلا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آپ اکبر خان صاحب۔''

''جی ہاں لیکن آپ......''

''شکر ہے کہ آپ مل گئے۔ میں عظیم خاں کا پرسنل سکریٹری کرامت علی ہوں۔''

''عظیم خان......وہ میرے چچیرے بھائی.....''

''جی ہاں آپ کے چچیرے بھائی جو کہ بہت امیر تھے۔''

''تھے......کیا مطلب......''

''جی ان کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے اور وہ اپنی ساری جائداد اور اپنی معصوم بچی کا آپ کو سرپرست بنا گئے ہیں۔ ان کی وصیت کے مطابق آپ کو گلاب نگر چلنا ہوگا اور ان کی معصوم بیٹی جو کہ اب یتیم ہے، اس کے بالغ ہونے تک ان کے کاروبار اور بیٹی کی سرپرستی کرنی ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھئے سر کہ انگنت نمک خواروں کے درمیان انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ آپ کو اپنی بیٹی اور جائداد کا سرپرست بنایا۔''

اکبر کا دماغ چکرا گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عظیم خان کی بچی سے بھی وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اسے پرانے دن یاد آنے لگے۔

''لیکن میں تو اپنے دونوں یتیم بچوں کی سرپرستی بھی نہیں کر سکا۔'' وہ من ہی من بڑبڑایا۔

''کیا سوچنے لگے سر......''

''قدرت کو سوچ رہا ہوں۔ میں کیا چاہتا تھا اور قدرت کیا چاہتی ہے۔ چلئے کب چلنا ہے۔ ممکن ہے قدرت نے اپنے گناہوں کا ازالہ کرنے کا وقت دیا ہو۔''

''کیسا گناہ......سر''

''کچھ نہیں.....آپ نہیں سمجھیں گے چلئے کب چلنا ہے۔''

''ابھی چلیں تو۔''

''چلئے۔''

اکبر نے اپنے معصوم بچے کو گود میں اٹھایا اور کرامت علی کے ساتھ چل پڑا۔

(٦)

رحمت اللہ انور کو سمجھا رہا تھا۔

''بیٹا ایک بار ماں باپ سے ملنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے لیے فکر مند ہوں اور اپنے کیے پر پچھتا رہے ہوں۔ اچھا اگر تمہارا دل چاہا تو تم وہاں رکنا نہیں تو ہم واپس آ جائیں گے۔ اب ٹھیک ہے۔''

''یہ کیا بار بار میرے بیٹے کو مجھ سے دور کرنے کی بات کرتے ہو۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔''

رحمت اللہ اپنی بیوی کو کونے میں لے گیا اور دھیمے سے بولا۔

''بیگم۔ خدا کا خوف کھاؤ۔ یہ کسی کی امانت ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارا کوئی اولاد نہ ہونے کا درد، لیکن خدا پر یقین رکھو۔ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی کریں گے تو خدا ہماری نیکی کا صلہ ہم کو دے گا۔''

رحمت اللہ کی بیوی نے دکھے ہوئے دل سے انہیں وداع کیا اور خدا سے فریاد کرنے لگی۔ رحمت اللہ جب انور کو لے کر اکبر خان کے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا ملا۔

''اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ کون؟''

''میں ہوں بیگم۔''

''کیا ہوا۔ اتنی جلدی.....''

بیگم کی نظر انور پر پڑی۔ انور دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ رحمت اللہ کی بیوی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

(۷)

اکبر خان اب رئیسوں کی زندگی بسر کر رہا تھا پھر بھی وہ یہ بات نہیں بھولا تھا کہ وہ محض اس دولت کا سرپرست ہے۔ کبھی کبھی اسے یہ ڈر بھی ستاتا کہ شادی کے بعد کہیں زرینہ اور اس کا شوہر اسے اور اس کے بیٹے اقبال کو ان کی نوکر والی حیثیت نہ دے دیں۔ اس وقت وہ مالک تھا اور مالک سے نوکر بننے کا تصور کر کے ہی لرز اٹھتا تھا۔ اپنے مالک بنے رہنے کا طریقہ اس نے یہ سوچا تھا کہ اس کے بیٹے اقبال اور زرینہ کی شادی ہو جائے تو اس عیش و آرام میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔

''چچا جان میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ فٹبال میچ دیکھنے جاؤں۔''

''ضرور جاؤ بیٹی لیکن کل کہیں نہیں جانا۔ تمہیں پتہ ہے نا کہ کل اقبال ولایت جا رہا ہے۔''

''جی بالکل۔''

اکبر اور زرینہ اقبال کو ہوائی اڈہ رخصت کرنے کے بعد واپس آئے تو نکہت زرینہ کا انتظار کر رہی تھی۔

''ارے نکہت تم۔''

''ہاں۔ آج تم کالج کیوں نہیں آئی۔''

''وہ اقبال بھائی ولایت جا رہے تھے نہ اس لیے ان کو چھوڑنے ہوائی اڈہ جانا پڑ گیا۔''

''اچھا کل کالج میں مشاعرہ ہے۔ سب سے دلکش غزل پر انعام بھی ملے گا۔ تمہارا نام شاعروں کی فہرست میں ہے۔ اس لیے ایک بہترین غزل لکھ ڈالو۔''

''ٹھیک ہے بابا.....لیکن پہلے اندر چل۔ مجھے تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

(۸)

مشاعرہ گاہ میں جم غفیر تھا۔ صدر صاحب کے آتے ہی اعلان ہوا۔

''حضرات جیسا کہ آپ سب واقف ہیں کہ اس مشاعرے میں شہر کے مشہور کالجوں کے دو دو طلبہ حصہ لے رہے ہیں۔ ۱۰ کالجوں کے ۲۰ طلبہ و طالبات کی غزلوں میں سے ۳ بہترین غزلوں کو اول، دوم اور سوم انعام دیا جائے گا۔ سب سے پہلے میں میڈیکل کالج کے ڈاکٹر احمد روانی کو آواز دیتا ہوں کہ اسٹیج پر تشریف لائیں اور اپنا کلام پیش کریں۔

''غزل کچھ اچھی نہ تھی۔'' زرینہ نے نکہت سے کہا۔

''غزل لکھنے کے لیے خون جگر کو صفحات پر اتارنا پڑتا ہے۔ سائنس والوں کے بس کا یہ کام نہیں۔ انہیں اپنے اور غزل سننے والوں کے وقت کا خیال کرتے ہوئے لیبارٹیری میں جا کر آکسیجن اور نائٹروجن کا تجربہ کرنا چاہیے۔ مشاعرہ کوئی کیمیائی عمل نہیں ہے۔''

جاوید آگے والی سیٹ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے اپنے ساتھی کی بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ان دونوں کو گھور کر دیکھا۔ اور زرینہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک کے بعد ایک طلبہ و طالبات آتے رہے اور اپنا کلام سناتے رہے۔ زرینہ کی بھی باری آئی۔ اس کی مترنم آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ''مکرر'' اور تالیوں سے پورا ہال گونج اٹھا۔ اس کے بعد بھی جن طلبہ و طالبات نے کلام سنایا، ان میں کوئی بھی زرینہ کے معیار تک نہیں پہنچ سکا۔ آخر میں میڈیکل کالج کے جاوید کا نام پکارا گیا۔ میڈیکل کالج کا نام سنتے ہی زرینہ نے مان لیا کہ سونے کا تمغہ اس کا ہو گیا۔ نکہت نے زرینہ سے کہا۔

''یہ وہی لڑکا ہے جو میڈیکل کالج کے تمہارے تبصرے کو سن کر تمہیں بری طرح گھور رہا تھا۔''

''اونھ۔ برا لگ گیا ہوگا۔''

جاوید نے آتے ہی مائک پر سب کو سلام کرنے کے بعد کہا۔

''دوستو! ہمارے کچھ شاعر دوست سمجھتے ہیں کہ صرف ادب کا طالب علم ہی اچھی غزل کہہ سکتا ہے جبکہ میرا یہ خیال ہے جو بھی ادب کے متعلق گہرا ذوق اور مطالعہ رکھتا ہے اور بہترین طریقے سے فن کو برتنا جانتا ہے، وہ بہترین شاعر ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے فن پر قدرت درکار ہے۔ صرف ادب کا طالب علم ہونا اس کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اپنی غزل پیش کرتا ہوں۔''

جاوید احمد تنویر نے اپنی مترنم آواز میں جو غزل شروع کی تو پورا ہال حیرت اور جوش کے عالم میں ڈوب گیا۔ خود زرینہ بھی حیرت زدہ رہ گئی۔ اسے قطعی گمان نہیں تھا کہ میڈیکل کا طالب علم اتنا بہترین شاعر بھی ہوسکتا ہے۔ جاوید کے مقطع کے شعر پر تو سامعین نے پورا ہال سر پر اٹھالیا۔ صدر صاحب بھی کرسی سے اچھل کر داد دینے کو مجبور ہوگئے۔ مقطع تھا۔

تنویر زیست وہ نہیں جو ہو بغیر غم
کچھ خود کو، کچھ رقیب کو ترسا کے پی گیا

نتیجے کا اعلان کیا گیا۔

''صدر صاحب کے فیصلے کے مطابق پہلا انعام جاوید احمد تنویر کو دوسرا زرینہ عظیم کو اور تیسرا انعام اقبال احمد صدیقی کو دیا جاتا ہے۔''

زرینہ مایوس تھی۔ نکہت نے کہا۔

''بہت اچھا شاعر ہے جاوید احمد تنویر۔''

''شٹ اپ۔''

''ارے یار چھوڑ بھی۔ اس کی غزل تجھ سے اچھی تھی، اس لیے وہ پہلے انعام کا یقیناً حقدار تھا۔ کیا مقطع تھا۔

تنویر زیست وہ نہیں جو ہو بغیر غم
کچھ خود کو، کچھ رقیب کو ترسا کے پی گیا

''اوہ۔نون سینس۔''

(۹)

زرینہ سوچ رہی تھی کہ اگر جاوید احمد تنویر نہ ہوتا تو پہلا انعام اسے ہی ملتا۔غزل سنانے کے پہلے کے جاوید کے جملے اس کے دل میں نشتر چبھو رہے تھے۔

''یہ ادب کے طالب علم سمجھتے ہیں......''میں اس بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔ضرور لوں گی۔''

نکہت نے جاوید سے کہا۔

''زرینہ آپ کی شاعری سے بہت متاثر ہے اور آپ سے میرن کلب میں ملنا چاہتی ہے۔''

''میرن کلب بہت مہنگی جگہ ہے۔میرے بس سے باہر.......''

''دراصل آپ سمجھے نہیں۔کل اس کی سالگرہ ہے اور وہ اپنے کچھ مخصوص دوستوں کو پارٹی دے رہی ہے۔اس نے کہا ہے کہ اگر آپ صرف ایک گلاب کا پھول ہی لے کر آجائیں گے تو وہی اس کے لیے سالگرہ کا سب سے قیمتی تحفہ ہوگا۔''

''لیکن میں......''

''دیکھئے انکار نہ کیجیے گا۔اس نے کہا ہے کہ اگر آپ نہیں آئیں گے تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔آپ شام کو ضرور آیئے۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔جاوید سوچتا رہ گیا۔

''کیا کروں۔چلو چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں کہ امیروں کی پارٹی کیسی ہوتی ہے۔اور پھر اس نے اتنے خلوص سے بلایا ہے تو اخلاقی فرض بھی ہے کہ جانا چاہیے۔''

لیکن وہاں اس کی مفلسی کا خوب مزاق اڑایا گیا۔نکہت نے احتجاج کیا لیکن اس کی آواز دبا دی گئی۔بڑی بے عزتی کے ساتھ جاوید بغیر کھائے پیئے گھر لوٹا۔

''اب جا کر مجھے سکون ملا۔ بچو کو پتہ چل گیا ہوگا کہ کسی امیر لڑکی سے ٹکرانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

''ہاں اور آج مجھے بھی پتہ چل گیا کہ تم اپنے غرور کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔''

''دیکھو نکہت میں کب سے تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔ تمہیں جاوید سے اتنی ہمدردی کیسے ہوگئی۔ تم میری سہیلی ہو اس لیے......''

''سہیلی.....! کون سی سہیلی۔ میں تمہاری سہیلی تھی۔ اب مجھے بھول جانا.....'' یہ کہہ کر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ زرینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

دوسرے دن صبح زرینہ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ اسے نکہت دکھائی پڑی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نکہت سے بات کرے کہ نکہت ایک طرف تیزی سے چلنے لگی۔ زرینہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔ نکہت جاوید کے پاس جا کر رک گئی۔

''مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کی اتنی بے عزتی ہوئی۔ میں نے ہی آپ کو دعوت پر بلایا لیکن یقین کیجیے مجھے معلوم نہیں تھا......میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔''

''اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں.....دراصل میں ہی دیکھنا چاہتا تھا کہ امیروں کی پارٹی کیسی ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہاں اپنے غرور کی تسکین کے لیے غریبوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔''

زرینہ ان کی باتیں سن کر من ہی من افسوس کرنے لگی۔

(۱۰)

رحمت اللہ کندھے پر جھولا لٹکائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

''لو بیگم گھر کا راشن لے آیا۔ آپ کے صاحب زادے کہاں ہیں۔''

''ارے یہیں کہیں گیا ہوگا کھیلنے۔''

''جس عمر میں بیٹا باپ کا سہارا بنتا ہے۔ شادی بیاہ کی سوچتا ہے، میٹرک پاس کر کے اس عمر میں آوارہ گردی کر رہے ہیں۔ تم نے انور کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ بہت بگڑ گیا ہے۔''

''دیکھو جی۔ میرے لاڈلے کو ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ بچہ ہی تو ہے۔''

ادھر انور آوارہ گردوں کے ایک مجمع کو سمجھا رہا تھا۔

''پڑھائی لکھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود بہت ضروری ہے اور میں سمجھتا ہوں کھیل کود زیادہ ضروری ہے۔ لیکن بغیر پڑھائی لکھائی کے یہ بھی بے کار ہے اس لیے تم سب کو پڑھنا نہایت ضروری ہے اور اس میں سائنس پڑھنے سے آج کی دنیا میں زیادہ ترقی کی جاسکتی ہے۔ میں نے خود سائنس میں میٹرک کیا ہے۔ اس لیے میں تم کو سائنس کا کچھ سبق پڑھاتا ہوں۔''

سائنس کے کچھ سبق پڑھانے کے بعد وہ دریا کی جانب نکل پڑا۔ دریا کے کنارے ایک خوبصورت حسن کی ملکہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''او حسن کی ملکہ۔ گل گلزار، جان بہار۔ تمہیں دیکھ کے روح خوش ہو جاتی ہے۔ میں اس دن کو سوچ کر مسرت میں ڈوب جاتا ہوں جب ہماری شادی ہوگی اور تمہارا یہ نشیلا حسن صرف میرا ہوگا۔''

''لیکن اب جلدی کرنی ہوگی کیونکہ اس حسن کو دوسرے کی بانہوں میں دینے کی کوششیں حویلی میں جاری ہیں۔''

''ایسی کیا بات ہے جان من۔ چلو ابھی تمہارے والد صاحب سے تمہارا ہاتھ مانگ لیتے ہیں۔''

''میرے والد صاحب جب تم سے پوچھیں گے کہ تم کماتے کتنا ہو تو تم کیا جواب دو گے۔ مجھے کہاں سے کھلاؤ گے یا اپنی طرح مجھے بھی اپنے والد کی کمائی پر ہی رکھو گے۔''

زندگی میں شاید پہلی بار انور سنجیدہ ہوا۔''ہوں........کمانا ضروری ہے۔''

''بہت ضروری ہے۔''

محبوبہ سے رخصت ہونے کے بعد انور اپنے گھر آیا۔

''آ گیا بیٹا۔ میں نے تیرے کھانے کے لیے تیرے پسند کی چیزیں بنائی ہیں۔''

''ہاں ماں اب تک تو کھاتا ہی رہا ہوں۔ اب کمانا بھی چاہیے۔''

''بیٹا۔ تمہارے ابا بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔ میں خوش ہوں کہ تم نے یہ بات سوچی۔''

انور سمجھ گیا تھا کہ اگر اس نے کمانا شروع نہ کیا تو نسرین سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ کمانا اب اس کے لیے ایک جنون بن چکا تھا۔ لیکن کون سا کام جس میں عزت بھی ہو اور کمائی بھی اچھی.....

اس وقت دوسری جنگ عظیم کے سبب فوج میں بھرتی زور شور سے چل رہی تھی اور سائنس کے طالب علم کو سیدھے افسر بننے کی دعوت تھی۔ انور نے بھی فارم بھر دیا اور تیسرے ہی دن اس کا بلاوا آ گیا۔ اس نے اپنے گھر پر بتایا۔

''ماں مجھے نوکری مل گئی۔ لیکن دور جانا پڑے گا۔''

''نہیں......میں تجھے دور نہیں جانے دوں گی۔ سنتے ہو۔ انور نوکری کے لیے دور جانا چاہتا ہے۔''

''تو اس میں برائی کیا ہے۔ لوگ تو باہر جاتے ہی ہیں۔''

رحمت اللہ کی بیگم نے سو سو بلائیں لے کر انور کو رخصت کیا۔ انور نے نہ تو ماں کو اور نہ ہی والد کو یہ بتایا کہ وہ فوج کی نوکری کر رہا ہے۔ اس نے دوسری نوکری کا بہانہ بنا دیا۔ اس کو

نوکری پر گئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ اس کا تار آیا۔

''میرا تار اس پتے پر۔ کس کا۔ اوہ شاید عبدالغفار نے بھیجا ہوگا کیونکہ میں نے اس کو ماں اور ابا کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔'' تار میں لکھا تھا۔

''ماں باپ بیمار ہیں جلدی چلے آؤ۔''

اس نے تار اپنے افسر کو دکھایا۔ دس دن کی چھٹی مل گئی۔

وہ بس اڈہ اترا۔ یہاں سے گاؤں ۳ میل تھا۔ وہ ٹانگے پر سوار ہوا۔ گاؤں کے کنارے پہنچتے ہی اس نے راستوں پر سجاوٹ دیکھی۔

''کیا یہاں کوئی میلہ ہے۔''

''نہیں بابو یہاں کے سب سے امیر آدمی کی بیٹی نسرین کی شادی تھی۔ اس لیے....''

''نسرین کی شادی۔ تو کیا کل نسرین کی شادی ہوگئی۔ لیکن میں نے تو کہا تھا کہ میرا انتظار کرنا۔'' وہ من ہی من بڑبڑایا۔

''کیا شادی کے وقت آپ وہاں تھے۔''

''جی بابو جی۔''

''دلہن خوش تھی۔''

''کیوں خوش نہیں ہوگی بابو جی۔ امیر خاندان، امیر خاوند، اب اور کیا چاہیے۔ آپ کی گلی آ گئی۔''

''اچھا یہ لو پیسے۔'' پیسے دے کر وہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ ماں اور ابا نظر نہیں آ رہے تھے۔

''کیا ہوا۔ آپ اتنے لوگ یہاں۔ ماں اور ابا کہاں ہیں۔''

''بیٹا صبر سے کام لو۔ خدا دونوں کی مغفرت فرمائے۔ انہیں شاید کوئی صدمہ لگ گیا تھا اسی لیے ایک گھنٹے کے اندر ہی دونوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب تو تمہیں ان کے لیے ایصال ثواب کرنا چاہیے۔''

انور دونوں کی قبر پر گیا۔ فاتحہ خوانی کی۔ اپنا سکھ دکھ ان سے کہا اور واپس آ گیا۔ اب

اس کے لیے گاؤں میں کیا تھا۔ وہ واپس نوکری پر چلا گیا۔

(۱۱)

زرینہ خود کو گنہگار سمجھنے لگی۔ اس کے غرور کے سبب اس کی سہیلی نکہت کا بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ جاوید بھی اب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی۔ اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا۔

اکبر نے گاڑی سے اتر کر بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے نوکر کو آواز دی۔

''شمو.....او شمو.....کہاں گیا۔''

''جی سرکار......وہ بٹیا کے پاس تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''بخار......بٹیا کہاں ہے۔''

''اپنے کمرے میں۔''

''کیا ہوا بیٹی۔''

''کچھ نہیں چچا جان۔ بس تھوڑا سا بخار رہتا ہے۔''

''بخار رہتا ہے۔ تو بیٹی ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلایا۔ شمو فوراً ڈاکٹر بلاؤ۔''

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ جی آپ کی بیٹی کے کچھ ٹیسٹ لینے ہوں گے۔ ابھی میں ان کا خون لے کر جا رہا ہوں۔ کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد پھر حاضر ہوتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے خون کی جانچ کے بعد کہا۔

''نرس لڑکی کو Recumatic fever ہے۔ اسے ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ ہمارے اسسٹنٹ ڈاکٹر جاوید کہاں ہیں۔ انہیں بلایئے۔''

''ڈاکٹر جاوید آ گئے۔''

''مجھے بہت خوشی ہے ڈاکٹر کہ تمہیں نوکری کی ابتدا کیے ہوئے چھ ماہ ہی ہوئے ہیں لیکن اپنی صلاحیت سے تم نے میرے دل میں ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ ابھی ایک مریض کے پاس چلنا ہے۔''

''جی میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

ڈاکٹر غیاث نے اکبر خان سے کہا۔

''آپ کی بیٹی کو رہ رہ کر بخار آرہا ہے۔ اس کو آرام کی سخت ضروری ہے۔ میں شہر سے باہر جارہا ہوں۔ یہ میرے جونیئر ڈاکٹر جاوید ہیں۔ بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ یہ اور ایک نرس مریض کا علاج کریں گے۔ تین چار دن تک ان کو یہیں رہنا پڑے گا۔ نرس ہر دم زرینہ بیٹی کے پاس رہے گی۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ شمو۔ ڈاکٹر جاوید کے رہنے کا بندوبست کرو۔''

ڈاکٹر جاوید زرینہ کے کمرے میں گیا۔ نرس نے کہا۔

''ڈاکٹر جاوید انجکشن اور دوا کا وقت ہو گیا۔''

''ڈاکٹر جاوید۔'' زرینہ نے آنکھیں کھولیں۔ ''جی آپ''

''جی محترمہ میں ڈاکٹر جاوید ہوں اور ڈاکٹر غیاث کے حکم سے آپ کا علاج کرنے آیا ہوں۔ آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ نرس آپ کو دوا اور انجکشن دیتی رہے گی۔ میں وقت وقت پر آپ کا چیک اپ کرتا رہوں گا۔ لگتا ہے کہ آپ کے دل میں کوئی صدمہ گھر کر گیا ہے۔ اسے نکال دیجیے۔ خوش رہئے۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔''

زرینہ اپنے ٹھیک ہونے تک ڈاکٹر جاوید سے معافی مانگتی رہی۔ اپنے پیار کا اظہار کرتی رہی۔ جب ڈاکٹر جاوید کی رخصتی کا وقت آیا تو اس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ اگر وہ اس کے پیار کو ٹھکرا دے گا تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گی۔ ڈاکٹر جاوید بھی کوئی پتھر دل نہیں تھا۔ وہ بھی زرینہ کو من ہی من چاہنے لگا تھا۔ اس نے زرینہ کو گلے سے لگالیا۔

(۱۲)

انور کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ فوجی ساتھی بھی اسے دیکھ کر دکھی ہوتے کہ اتنا زندہ دل انسان اب ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ زندگی سے بیزار دن یوں ہی گزرتے رہے کہ ایک دن جنگ کی چنگاری اس کے کیمپ پر بھی گری اور حکم ہوا کہ دشمنوں کو جواب دیا جائے۔ انور نے سوچا چلو زندگی کسی کام تو آئی اور وہ بھی عظیم مقصد کے لیے۔ اپنا ملک، اپنی قوم کی خدمت سب سے بڑی خدمت ہے۔ وہ اپنے فوجی ساتھیوں کے ساتھ مورچے پر ڈٹ گیا۔ دو دن تک شدت کی گولی باری ہوتی رہی۔ پھر دونوں جانب سناٹا چھا گیا۔ دو دنوں تک خاموشی کے بعد دشمن نے پھر لڑائی چھیڑ دی۔ انور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جواب دینے کو تیار تھا۔ شدید جنگ شروع ہوئی۔ لیکن دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ پورے منصوبہ بند طریقے سے چوکی پر قبضہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ انور کے افسر کو ہیڈ کوارٹر سے اس کی اطلاع ملی اور چوکی چھوڑ کر وہاں سے نکل جانے کا حکم۔ لیکن انور دوسری بات سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے افسر سے کہا۔

''اگر اس سامنے والی پہاڑی کی اونچی چوٹی پر پہنچ کر ادھر سے بمباری کی جائے تو دشمن کی فوج میں انتشار پھیل سکتا ہے۔ وہ یہ سمجھے گی کہ ہم نے ان کو گھیر لیا ہے۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے گی۔''

''لیکن کمانڈر، یہ تو بہت مشکل ہے۔ سامنے والی پہاڑی تک پہنچنے کے لیے ایک بڑے نالے سے گزرنا پڑے گا۔ راستہ کافی خطرناک ہے اور اتنی جلدی وہاں تک پہنچنا.....''

''وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے سر۔ آپ کم از کم آدھے گھنٹے تک کسی بھی حال میں یہیں رکے رہیں اور دشمن فوج کو آگے بڑھنے سے روکتے رہیں۔ باقی کا کام میرا ہے۔''

''او. کے. گڈ لک کمانڈر۔''

کمانڈر ان چیف سے رخصت لے کر انور نے ۱۰۰ سے زائد بم تھیلے میں رکھے اور اپنی پیٹھ پر باندھ کر نالے کی جانب دوڑ لگا دی۔

دشمن فوج قریب آتی جا رہی تھی۔ کمانڈر ان چیف کے ساتھ سارے جوان مورچے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اب یہ فاصلہ تقریباً ۱۰۰ افٹ تک رہ گیا تھا کہ دشمن فوج کے اوپر پیچھے سے بمباری ہونے لگی۔

''لگتا ہے انور پہنچ گیا ہے۔'' کمانڈر ان چیف کے ساتھ ساتھ جوانوں میں دوگنا جوش بھر گیا۔ انہوں نے اتنے زور سے فوجی نعرہ بلند یا کہ ان کی آواز چاروں جانب گونج اٹھی۔ دشمن فوج کے کمانڈر نے سوچا کہ ان کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ ابھی ایک طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اب دوسری جانب سے بمباری ہونے لگی۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد تیسری جانب سے بھی حملہ ہو جائے۔ ادھر پیچھے سے بمباری شدید ہو گئی تھی۔ انور نے ۷۰ سے زائد بم پھینک ڈالے تھے۔ دشمن فوج میں انتشار پھیل گیا۔ ان کے کمانڈر نے فوج کو تیزی سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ انور جدھر سے بم پھینک رہا تھا، اس طرف بھی دشمن فوج گولی باری کرتے ہوئے پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ ایک گولی انور کے پیر میں لگی لیکن اس نے بم پھینکنا جاری رکھا۔ دشمن فوج پیچھے ہٹتے ہٹتے اپنی چوکی تک چلی گئی اور فائرنگ بند ہو گئی۔ کمانڈر ان چیف نے فوراً جوانوں کو انور کی جانب دوڑایا۔ انور لڑکھڑاتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا۔ جوانوں نے اسے سنبھالا اور چوکی تک لے آئے۔ کمانڈر ان چیف نے فوراً فوجی ڈاکٹر اور نرس کو بلوایا جنہوں نے انور کے پیر کی گولی نکال دی لیکن خون کافی بہہ گیا تھا۔ اس لیے اسے اسپتال لے جانا بے حد ضروری تھا۔ ڈاکٹر کو اور فوجی گھائلوں کو دیکھنا تھا اس لیے اس نے کمانڈر ان چیف سے کہا۔

''آپ ایک گاڑی میں انور کو فوجی اسپتال بھیجنے کا بندوبست کریں۔ نرس بھی ان کے ساتھ جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ایک جوان کو حکم دیا۔

''جوان۔ کمانڈر کو جیپ میں لے جاؤ۔''

''جو حکم۔''، تبھی ایک دوسرا جوان جو نرس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا، آگے

آ کر بولا۔

''سر۔ یہ جوان ڈرائیوری میں کمزور ہے۔ راستہ اونچا نیچا اور پتھریلا ہے۔ مجھے ان راستوں پر جیپ چلانے کا بہت تجربہ ہے۔''

''ٹھیک ہے جوان۔ تم فوراً جیپ نکالو۔''

جوان اونچے نیچے راستوں کو عبور کرتے ہوئے تیزی سے فوجی اسپتال کی جانب جیپ بھگائے لیے جا رہا تھا۔ پیچھے نرس بیٹھی تھی اور انور لیٹا ہوا تھا۔ انور پر غش طاری تھا۔ رہ رہ کر وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔

''ڈرائیور۔ تمہارے پاس پانی ہے۔''

''نہیں نرس۔ کیا ہوا۔''

''مریض بے ہوش ہو گیا ہے۔ کہیں پانی دکھائی دے تو گاڑی روکنا۔ وہاں سے پانی لیں گے۔''

''ٹھیک ہے نرس۔''

پانی کی جگہ جیپ رکی۔ نرس پانی لینے کے لیے اتری۔ انور بے ہوش تھا۔ ڈرائیور کے دماغ میں ہوس جاگ اٹھی۔ وہ بھی دھیرے سے نیچے اترا اور نرس کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے ڈرائیور۔ میں کمانڈر سے کہہ کر تمہارا کورٹ مارشل کرا دوں گی۔''

''جان من تم چاہے جو کراؤ۔ میں تو تمہاری کنواری جوانی کا رس چوس کر رہوں گا۔ اسی لیے تو میں نے اس ڈرائیور کو روک کر خود گاڑی چلانے کی پیش کش کی تھی۔''

نرس چیخنے لگی۔ اس کی چیخ سے انور کی بے ہوشی ٹوٹ گئی۔ ڈرائیور نے نرس کا منھ زور سے دبایا اور اسے اٹھا کر کچھ دور گھنی جھاڑیوں میں لے گیا اور زمین پر پٹک دیا۔

''میں کہتا ہوں سیدھی طرح مان جا۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ تو بھی جوانی کا مزہ لے لے۔ نہیں تو.....'' اس نے پستول نکال لیا۔

''جلدی سے کپڑے اتار کر لیٹ جا نہیں تو مجبوراً مجھے تیری لاش کے ساتھ ہوس پوری کرنی پڑے گی۔''

''مجھ پر رحم کرو۔ اس مریض پر ترس کھاؤ۔ اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے نہیں تو وہ مر بھی سکتا ہے۔''

''اسے مرنے دے۔ تو اپنی فکر کر۔ نہیں تو تجھے بھی مار کر ان جھاڑیوں میں ڈال دوں گا۔ چل اب جلدی کپڑے اتار۔''

نرس بے بس تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے کہ ڈرائیور کی خوفناک آواز فضا میں گونجی۔ انور پستول لیے ہوئے اس کے سینے پر کھڑا تھا۔

''حرام زادے۔ فوج کو بدنام کرتا ہے۔ تو بھول گیا کہ جب فوج کے وقار پر حرف آتا ہے تو ایک سچا فوجی موت کو بھی مات دے کر قبر پھاڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ میں تو صرف بے ہوش تھا۔ اب میں تجھے یہیں گولی مار دوں گا اور ابھی بھی اس جسم میں اتنی قوت ہے کہ پانی کے چھینٹوں سے چہرے کو بھگو کر میں خود ہی گاڑی چلا کر اسپتال پہنچ سکتا ہوں۔''

ڈرائیور کے اوسان خطا ہو گئے۔ نرس دوڑ کر انور کے پیچھے آ گئی۔ ڈرائیور گڑگڑانے لگا۔

''مجھے..... مجھے..... معاف کر دیجیے سر۔ میں..... میں اپنا فرض بھول گیا تھا..... میں گاڑی چلا کر آپ کو اسپتال پہنچاتا ہوں۔''

''چل کتے۔ تیرا فیصلہ بھی وہیں فوجی کورٹ میں ہوگا۔ نرس تم پانی لے کر جیپ میں چلو میں اس کو لے کر آتا ہوں۔''

جیپ میں بیٹھتے ہوئے انور نے نرس کے ہاتھ میں پستول دیتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔

''پانی پی کر میں خود کو ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں۔ تمہاری چیخ سن کر بے ہوشی ٹوٹ گئی تھی اور میں لڑکھڑاتا ہوا پانی تک پہنچا۔ پانی پیا۔ پانی سے سر بھگویا تب جان میں جان آئی۔ اس لیے میں اسے قابو میں کر پایا۔ اگر خدانخواستہ میں پھر بے ہوش ہو جاؤں اور یہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرے تو تم اسے گولی مار دینا۔ ویسے خدا نے چاہا تو یہ نوبت نہیں آئے گی۔''

وہ نوبت نہیں آئی۔ اسپتال پہنچتے ہی نرس کے بیان پر ڈرائیور کو گرفتار کر لیا گیا۔ انور کو

علاج کے لیے لے جایا گیا۔

(۱۳)

دو دنوں کے بعد انور خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ نرس اس کے کمرے میں آئی۔

''کیسا لگ رہا ہے کمانڈر۔''

''اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ ارے یہ آپ کی آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں۔ لگتا ہے ایک دو دنوں سے آپ سوئی نہیں۔''

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے کمانڈر۔ جب سے آپ اسپتال آئے ہیں، مس رعنا لگاتار جاگ رہی ہیں اور آپ کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔''

''مس رعنا۔''

''جی.....میرا نام ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر اب تو میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں تو اب ان کو بھی آرام کرنا چاہیے۔''

''آپ انہیں کی خدمت کے سبب اتنی جلدی بہتر ہو پائے تو آپ ہی ان سے کہیے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے انور کا معائنہ کیا اور چلا گیا۔

''آپ نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ.....''

''ایسا مت کہیے آپ تو میرے لیے فرشتہ ہیں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو نہ جانے میرا کیا.....''

''اس کا ذمہ دار بھی تو میں ہی ہوں۔ نہ میں گھائل ہوتا اور نہ آپ کو اس طرح میرے ساتھ آنے کا حکم ملتا۔ اور نہ یہ سب ہوتا۔''

''یہ تو میری ڈیوٹی تھی لیکن آپ نے جس طرح بے ہوشی کی حالت سے اٹھ کر میری عصمت بچائی میں کیا بتاؤں کہ آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میری نظروں میں آپ کا کیا درجہ ہے۔ آپ کی بہادری کے سبب ہی ہم سب اپنی چوکی میں محفوظ رہے، ہماری چوکی محفوظ رہی۔ میں تو یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ اگر ہماری چوکی پر دشمن فوج کا قبضہ ہو جاتا اور ہم لوگ دشمن فوج کے ہاتھ لگ جاتے تو.....تو.....نہ جانے وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔''

''جو میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔ اور ویسے بھی جب تک میں زندہ ہوں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

یہ سنتے ہی رعنا نے اس کی جانب اس طرح دیکھا کہ جیسے وہ اس کی بانہوں میں سما جانا چاہتی ہو۔ انور بھی اس کی نظروں کو سمجھ گیا۔ دراصل وہ بھی رعنا سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ رعنا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور اس کے سینے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

(۱۴)

ڈاکٹر جاوید اور زرینہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ لیکن جاوید کو نہ جانے کیوں یہ خدشہ لگا رہتا کہ اکبر خان ان کی شادی نہیں ہونے دیں گے۔ امیر اور متوسط طبقے کی دوری ضروری اپنا رنگ دکھائے گی۔ ایک دن ساحل پر بیٹھے ڈاکٹر جاوید نے زرینہ سے کہا۔

''یہ اکبر خان تمہارے سگے چچا ہیں۔''

''نہیں نہیں..... یہ تو میرے دور کے رشتہ دار ہیں جو میرے پاپا کی وصیت کے مطابق میری سرپرستی کے لیے آئے ہیں۔ یہ تمام جائداد تو صرف میری ہے اور پاپا کی وصیت کے مطابق شادی کے بعد میں اس کی اکیلی وارث ہوں۔'' پھر اس نے اکبر خان کی پوری کہانی اس کو سنا دی۔

''اچھا تو یہ وہی اکبر خان ہیں۔''

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم ان کو جانتے ہو۔''

''تمہارے بتانے کے بعد تھوڑا تھوڑا جاننے لگا ہوں۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ یہ ہماری شادی ہونے نہیں دیں گے۔''

''تم بے کار میں شک کر رہے ہو۔ چچا جان ایسے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ ایسا کریں گے تو بھی کیا ہوگا۔ دولت میرے پاپا کی، میں تمہاری۔ تو پھر تمہیں کیا ڈر۔ بولو کب آ رہے ہو میرا ہاتھ مانگنے۔''

''کب آؤں۔''

''آج ہی۔''

''ٹھیک ہے۔ آج ہی آتا ہوں۔''

شام کو دروازے کی گھنٹی بجی۔ شمو نے دروازہ کھولا۔

''ارے ڈاکٹر صاحب آپ۔ آیئے۔ آیئے۔''

''اکبر خان صاحب ہیں۔''

''جی ہاں۔ وہ اور زرینہ بیٹی ہال میں بیٹھے ہیں۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔''

''آیئے ڈاکٹر صاحب۔ کافی دنوں بعد.... آیئے بیٹھئے۔''

''جی شکریہ۔ میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔'' اس نے زرینہ کی جانب دیکھا۔ زرینہ شرما گئی اور اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ لوگوں کے لیے چائے بھجواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور شمو کو چائے کے لیے کہہ کر پردے کی آڑ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

''چائے لیجیے ڈاکٹر صاحب۔ ہاں کیا ضروری بات ہے۔''

''جی میں آپ سے زرینہ کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔''

اکبر خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن اس نے اپنا غصہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہنگامہ ہوگا تو زرینہ بھی آجائے گی۔ اس کے دماغ نے ترکیب لڑانی شروع کردی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر مکاری کرتے ہوئے بول پڑا۔

''آپ کا خیال اچھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ لیکن اصل میں عظیم بھائی کی وصیت کے مطابق ان کی بیٹی کی شادی میرے بیٹے اقبال سے ہونی ہے اس لیے.......''

زرینہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پہلی بار اسے اکبر خان کی نیت پر شک ہوا۔

''وصیت۔ کون سی وصیت۔ جو وصیت انہوں نے کی تھی اس کی ایک کاپی تو میرے پاس بھی ہے جس میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے اور پھر عظیم خان کو کہاں معلوم تھا کہ آپ نے ایک بیوہ جس کو پہلے سے ایک بچہ ہے، سے دوسرا نکاح کرلیا اور اس سے آپ کا بیٹا اقبال پیدا ہوا۔''

اکبر کا سر چکرا گیا۔ ماضی کے اس طرح حال میں آنے کی توقع اسے قطعی نہیں تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ..... یہ.....سب جھوٹ ہے۔کون ہو تم.....اور.....تمہارے پاس وصیت کی کاپی کیسے آئی۔''

''اکبر خان میں تمہاری اس دوسری بیوی کا پہلا بیٹا جاوید ہوں۔ جو رقیہ سے شادی کے بعد تمہارا سوتیلا بیٹا بن گیا تھا۔اقبال کے پیدا ہونے کے بعد تم دونوں نے اپنے بن ماں کے بیٹے انور اور مجھ بن باپ کے بیٹے پر کس قدر ظلم ڈھائے۔یاد ہے۔اپنے گناہوں کو یاد کرو۔''

زرینہ یہ سب سن کر حیرت زدہ رہ گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پایا۔اکبر خان بالکل پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

''تو مکار ہے۔ایسا نہیں ہو سکتا۔تو زرینہ کی دولت کی لالچ میں آ کر اسے پھانس رہا ہے۔میں ابھی تیرے ہوش ٹھکانے لگواتا ہوں۔منا.....جان.....خورشید.....کہاں ہو.....''

''تو چونکہ خود ایک لالچی کتا ہے، اس لیے مجھے بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔لیکن میری رگوں میں تیرا گندہ خون نہیں ہے۔ میں تیری مکاری نہیں چلنے دوں گا۔ جیسے تم دونوں نے میرے اور انور کے اوپر ظلم توڑے، وہ اب اس معصوم زرینہ کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میں جلد ہی تجھ سے ملوں گا۔'' یہ کہہ وہ جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اکبر خان کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا لیکن جاوید کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور پورا جسم مانو پتھر کا ہو گیا تھا۔یوں لگتا تھا کہ اگر آج کوئی اس سے ٹکرایا تو اس کے لیے اچھا نہ ہوگا۔اس کے غصہ کو دیکھ کر اکبر خان کے آدمی سہم گئے۔ایک نے ذرا سامنے آنے کی ہمت کی۔ جاوید نے اس کو اٹھا کر ایسا پٹکا کہ وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔لگتا تھا کہ کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔دوسرے ساتھی یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ جاوید ایک اور آدمی کے پاس پہنچ گیا۔اس کو اتنا زوردار گھونسا جڑا کہ اس کے منہ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔تیسرا آدمی یہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔جاوید حویلی سے تیزی سے نکل گیا۔

اکبر خان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔اس نے ولایت میں اقبال کو ایک لمبا تار بھیجا۔

(۱۵)

جاوید گھر پہنچا تو اس کی ماں نے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔ بڑا تھکا لگ رہا ہے۔''

''ہاں ماں.... کام زیادہ تھا۔ کچھ پرانے کام بھی نکل آئے۔''

''پرانے کام۔''

''ہاں چلو چھوڑو۔ تم مجھے فوراً ایک پیالی گرما گرم چائے دو تا کہ تھکان اتر جائے۔''

''ابھی لائی بیٹا۔''

جاوید چائے پی ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ چپراسی تھا۔

''جناب ڈاکٹر غیاث نے اسی وقت آپ کو بلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔''

''اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں ابھی چلتا ہوں۔''

''کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب۔''

''آؤ بھائی ڈاکٹر جاوید۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ ملک کے شمالی علاقے میں قحط پڑا ہوا ہے۔ ہمیں بھی ایک ٹیم لے کر وہاں جانا ہے۔ اس میں آپ کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ کل صبح ہی نکلنا ہے۔ آپ اپنا سامان وغیرہ پیک کر لیں۔''

زرینہ ڈاکٹر جاوید سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ جاوید کی ماں نے اس کا استقبال کیا۔

''آؤ بیٹی..... کون ہو تم۔''

''جی میں..... میں عظیم خان کی بیٹی زرینہ ہوں۔ ڈاکٹر جاوید نے میرا اعلاج کیا تھا۔ کہاں ہیں وہ؟''

''ڈاکٹر غیاث نے کسی کام سے بلوایا ہے۔ تم بیٹھو بیٹی ابھی آجائے گا۔''
زرینہ کی بے چینی دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ بات دلوں کی ہے۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ من ہی من مسکراتے ہوئے اس نے چائے بنا کر زرینہ کو دی۔ وہ چائے پی ہی رہی تھی کہ جاوید آگیا۔

''ارے زرینہ تم یہاں۔ ماں یہ......''

''ہاں..... ہاں..... میں سمجھ گئی...... تم دونوں باتیں کرو۔''

''بات کرنے کا وقت نہیں ہے ماں۔ مجھے کل ملک کے شمالی علاقے میں، جہاں قحط پڑا ہے، وہاں اپنی ٹیم کے ساتھ جانا ہے۔ ابھی سامان بھی پیک کرنا ہے۔ زرینہ تم بالکل گھبرانا نہیں۔ تم اپنے گھر آرام سے رہو۔ میں لوٹ کر آؤں گا تو ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔''

''کیسی الجھنیں بیٹا۔''

''کچھ نہیں ماں۔ اچھا اب میں سامان پیک کرتا ہوں۔ زرینہ چلو تم کو پہلے چھوڑ آؤں۔''

''کتنے دنوں میں لوٹو گے۔ تمہاری باتیں سن کر میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ جب میں نے تمہیں چچا جان کے بارے میں بتایا تھا تو اسی وقت تم نے مجھے یہ سب باتیں کیوں نہیں بتائیں۔ یہ پورا معاملہ کیا ہے۔''

''سب کچھ بتاؤں گا زرینہ۔ سب کچھ۔ بس مجھے قحط زدہ علاقوں کے بیماروں کی خدمت کر کے لوٹ آنے دو۔''

(۱۶)

''اب جلد ہی تمہاری پٹی کھولی جائے گی۔لیکن......''

''لیکن کیا ڈاکٹر......''

''آں.....کچھ نہیں۔''

رعنا نے ڈاکٹر سے اکیلے میں دریافت کیا۔

''آپ انور سے اس کے گولی لگنے والے پیر کے بارے میں کچھ بولنے والے تھے ڈاکٹر۔''

''ہاں۔دراصل ہو سکتا ہے کہ پٹی کھلنے کے بعد پیر سیدھا نہ پڑے اور انہیں سیدھا چلنے کے لیے کسی لکڑی کے ڈنڈے یا چھڑی کا سہارا لینا پڑے۔لیکن یہ محض قیاس ہے ممکن ہے پیر بالکل سیدھا ہی پڑے۔میں نے یہی سوچ کر انور سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔''

''بہت اچھا کیا ڈاکٹر۔میں دعا کروں گی کہ پٹی کھلنے کے بعد میرے انور کو کوئی تکلیف نہ ہو۔''

''میرے انور کو....تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔''ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رعنا نے شرم سے سر جھکا لیا۔

لیکن وہی ہوا جس کا ڈاکٹر کو شک تھا۔اس نے انور سے کہا۔

''آپ کو ایک دو سال تک ایک چھڑی کا سہارا لینا پڑے گا۔اس کے بعد آپ کے پیر بالکل سہی پڑنے لگیں گے۔جو ورزش میں نے پیر کے لیے بتائی ہے،اسے کرتے رہیے۔ ہاں جب درد ہو تو ورزش ایک دو دنوں کے لیے روک دیجیے گا۔''

رعنا اسے تسلی دیتی رہی۔

''میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ آپ کا سہارا۔ صرف ایک دو سالوں ہی کی تو بات ہے۔ آپ کا پیر بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہاں۔ ایک سال یا پھر پورے ۳۶۵ دن یعنی ایک سال اور۔ اور اگر پھر بھی ٹھیک نہ ہوا تو ایک سال یعنی ۳۶۵ دن اور.....''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ آپ کو ٹھیک کرنا میری ذمہ داری ہے۔ چلیے آرام کیجیے۔'' رعنا کچھ ڈر گئی۔

''اچھا ہوا کہ یہ سب تم سے کوئی رشتہ قائم ہونے سے پہلے ہی ہو گیا۔'' انور من ہی من بڑبڑایا۔

''کیا کہا۔''

''کچھ نہیں۔''

''میں ڈیوٹی پر جاتی ہوں۔''

رات کو انور نے چپراسی کو جگایا۔

''جی صاحب۔''

''میرے پیر میں درد ہو رہا ہے۔ تم ذرا اسپتال جا کر رعنا میڈم کو لے آؤ۔''

''جو حکم صاحب۔''

چپراسی کے جانے کے بعد انور نے اپنا کچھ ضروری سامان سمیٹا اور چھڑی کے سہارے لنگڑاتے ہوئے انجان راستے سے انجان منزل کی جانب چل پڑا۔

''تم یہاں کیسے۔ تم سے کہا تھا نا کہ صاحب کو اکیلا مت چھوڑنا۔''

''میڈم، صاحب نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ان کے پیر میں درد ہو رہا ہے، اس لیے آپ کو بلایا ہے۔''

''اچھا ایک منٹ رکو۔'' وہ اپنی ہیڈ نرس سے چھٹی لینے چلی گئی۔

گھر پہنچنے پر اس نے انور کو وہاں نہ پایا۔

''مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ چلے جائیں گے۔''

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رعنا اب اداس رہنے لگی۔ ڈاکٹر بھی سمجھتے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک دن انہوں نے رعنا کو بلایا۔

''دیکھو بیٹی میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں۔ اور ہر غم کو، دکھ کو بھلانے کے لیے مرہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور بدلی ہوئی آب وہوا بھی مرہم کا کام کرتی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں ڈاکٹر صاحب۔''

''بیٹی ہمارے ملک کے شمالی حصے میں قحط پڑا ہے۔ ہر جگہ سے ڈاکٹروں کی ٹیم جا رہی ہے۔ ہمارے یہاں سے بھی ایک یونٹ کا وہاں جانا طے پایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم وہاں جا کر بیماروں کی خدمت کرو تو تمہارا من بھی لگا رہے گا، ثواب بھی ملے گا اور ممکن ہے اس نیک کام کے طفیل خدا انور کو پھر تم سے ملا دے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں جانے کی تیاری کرتی ہوں۔

(۱۷)

راکھن گاؤں آ گیا۔ ریل رک گئی۔ انور اترا اور چھڑی کے سہارے چلتا ہوا باہر آیا۔ یکا یک اسے ڈاکٹر کی نصیحت یاد آئی۔ ''ورزش جاری رکھئے۔'' اس کے دماغ نے جوش مارا۔

''مجھے اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ میں فوجی ہوں۔ اس طرح زندگی سے ہار جانا میری شان اور منصب کے خلاف ہے۔ آتے وقت کسی کو بتایا بھی نہیں۔ کم از کم فوجی ہیڈ کوارٹر تو خبر کر ہی دوں کہ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کے سبب میں کچھ دن گاؤں آیا ہوں۔'' یہ خیال آتے ہی اس نے ریلوے اسٹیشن کے ڈاک خانہ سے ہی فوراً ہیڈ کوارٹر تار روانہ کر دیا۔ ڈاک خانہ سے فارغ ہو کر وہ گاؤں کے لیے سواری دیکھنے لگا۔ ۳ ٹانگے والے وہاں کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس نے اس کو پہلے گاؤں چھوڑا تھا۔

''گاؤں چلو۔''

''چلو بابو۔''

راستے میں ٹانگے والے نے پوچھا۔

''بابو آپ یہاں کیوں آئے۔''

''کیوں آئے مطلب۔''

''ارے آپ کو پتہ نہیں۔ یہاں قحط پڑا ہوا ہے۔ دو سال سے اناج نہیں اگا۔ لوگ بہت پریشان ہیں۔ ہم سب آدھا پیٹ کھا کھا کر بچوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سرکاری مدد بھی آ رہی ہے لیکن اس پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جن کے گودام اناج سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں سرکاری مدد کے اناج سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی گاؤں والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم بھی آئی ہے جو علاج کر رہی ہے۔ آپ یہاں سے واپس چلے جائیے۔''

''یہاں سے کہاں جاؤں گا۔ اپنے گاؤں کو، گاؤں کے لوگوں کو مشکل میں چھوڑ کر فرار ہو جانا ایک فوجی کے معیار کے خلاف ہے۔ تم چلو۔''

ٹانگہ اس کے گھر کے پاس رک گیا۔ پیسہ دے کر اس نے دروازے پر نظر ڈالی۔ تالے پر زنگ لگ گیا تھا۔ اس نے ایک پتھر سے تالا توڑا۔ گھر کے اندر مکڑی کے جالے اور دھول بکھری ہوئی تھی۔ اس نے چوکی کو جھاڑا اور بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔

''ارے عبدالغفار تم۔''

''ہاں یار۔ تمہارے دروازہ کھولنے کی آہٹ ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ تم آئے ہو۔ لیکن اس وقت....''

''میں جانتا ہوں کہ گاؤں میں قحط پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔''

''تو اس کا مطلب ہے۔ کچھ دن یہیں رہو گے۔''

''ہاں یار۔ اب تو کچھ دن جو بھی سکھ دکھ ہے، وہ سب گاؤں والوں کے ساتھ ہی ہے۔''

''بہت اچھا.... میں کچھ گاؤں والوں کو بلاتا ہوں کہ گھر کی صفائی میں تمہارا ہاتھ بٹائیں۔ اور کچھ چاول رکھے ہیں جو کل سرکاری گاڑی نے دیے تھے۔ میں چاول بنا کر اس میں نمک ملا کر تمہارے کھانے کو لاتا ہوں۔ تم تھک گئے ہو گے۔''

گھر کی صاف صفائی ہوگی۔ چاول نمک کھا کر انور گاؤں کا حال چال لینے کے لیے نکلا۔ چاروں جانب عجیب سا عالم تھا۔ کہیں کہیں سے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک سنسان گلی میں تین لوگ کسی لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کو کچھ تجسس ہوا۔ وہ دھیمے سے ان کے پاس گیا اور ایک جھونپڑی کی آڑ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگا۔

''سوچ لورانی۔ گاؤں میں قحط پڑا ہے۔ اپنے کنوارے جسم کو کب تک بھوک سے

تڑپاتی رہو گی۔ اس قحط میں اپنی جوانی کا مزہ ہمیں دیتی رہو۔ تمہیں اور تمہارے ماں باپ، بھائی بہن کو کسی بھی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم جانتی ہو، ہم یہاں کے زمیندار کے بیٹے ہیں۔ ہمارے پاس اناج، کپڑے اور دولت کی کوئی کمی نہیں۔ بس اپنی سہیلیوں کے کنوارے بدن کی لذت بھی دلاتی رہو۔ کسی کو کوئی کمی نہیں ہوگی۔"

"نہیں ..... نہیں ..... مجھے قحط سے مرجانا منظور ہے، لیکن اپنی عصمت تم درندوں کے حوالے نہیں کروں گی۔"

"اگر تم سیدھی طرح نہیں مانو گی تو ہم زبردستی ..... تمہاری کنواری جوانی نے ہمیں پاگل بنادیا ہے اس لیے ....."

دونو جوانوں نے اسے پکڑ کیا۔ تیسرا اس کا منہ دبا کر اس کے کپڑے اتارنے لگا۔

"کمینو.... چھوڑ دو اس بے بس کو....."

"لنگڑے .... بھاگ جا یہاں سے۔ ورنہ تیری چھڑی سے تجھی کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالیں گے۔"

انور کا خون کھول اٹھا۔ وہ آگے بڑھا۔

"میں اس حسینہ کو پکڑے رکھتا ہوں۔ تم دونوں پہلے اس کا کام تمام کر دو۔ اس کے بعد آرام سے اس کے کنوارے پن کا رس قطرہ قطرہ چوسیں گے۔"

وہ دونوں آگے بڑھے اور انور سے بھڑ گئے۔ انور اپنے ایک پیر سے خود کو تھوڑا مجبور پا رہا تھا۔ جلد ہی دونوں نے اسے قابو میں کرلیا۔ ایک نے اس کو پیچھے سے پکڑا دوسرا چھڑی لے کر اس کے پیروں پر وار کرنے لگا۔ "ایک فوجی اور اس طرح ہار جائے۔" یہ خیال آتے ہی اس میں غضب کا جوش بھر گیا۔ اس نے اپنے ہلکے ٹیڑھے پاؤں کو کام میں لاتے ہوئے اس کا ایک بھرپور وار سامنے والے پر کیا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ جس نے انور کو پیچھے سے پکڑ رکھا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر سہم گیا۔ اس کی پکڑ تھوڑا ڈھیلی پڑ گئی۔ انور نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ایسا فوجی داؤں مارا کہ وہ بھی زمین پر دوہرا ہو کر گرا۔ انور نے لاتوں اور گھونسوں کی ایسی بارش کی کہ دونوں کے منہ سے خون کے

فوارے پھوٹ پڑے اور دونوں بے دم ہوکر بے ہوش گئے۔ انور نے تیسرے کی جانب خونی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ لڑکی کو چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ انور نے اسے دوڑا کر پکڑا اور اس کی بھی جم کر دھنائی کی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگا۔

''مجھے معاف کر دو..... میں ہوس میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے دونوں بے ہوش بھائیوں کو لے جانا ہے۔ مجھے بخش دو۔''

''حرام زادے۔ معافی مانگنا ہے تو اس بے بس لڑکی سے مانگ اور یاد رکھ جب تک میں گاؤں میں ہوں۔ پوری ایمانداری سے گاؤں والوں کی مدد کرنی پڑے گی ورنہ گاؤں والوں کو تیری اور تیرے بھائیوں کی کرتوت بتادوں گا اور پھر ہم سب مل کر تیری حویلی اور تیرے اناج کے گوداموں کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ تو جانتا ہے نا جب مفلس کی بھوک پر آبرو کے سودے ہونے لگتے ہیں تو ایک ایسا انقلاب جنم لیتا ہے جو آگ کا دریا بن کر تم زمینداروں کے غرور کو خاک کر کے تمہیں زندہ نگل جاتا ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کل سے ہر گاؤں والے کو اناج اور دوسری چیزیں میندار کی حویلی سے مفت ملیں گی۔''

''وعدہ پہ اٹل رہنا ورنہ..... چل اب اپنے نیم مردہ بھائیوں کو لے جانے کا بندوبست کر۔''

لڑکی انور سے لپٹ گئی اور اس کے سینے میں سر چھپا کر رونے لگی۔

''گھبراؤ مت بہن۔ جب تک تمہارا یہ بھائی زندہ ہے، گاؤں کی کسی بھی بہن بیٹی کی عصمت پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔''

انور کے پیر میں تھوڑا تھوڑا درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ رکھا تو اسے کچھ یاد آیا اور وہ مسرت سے چیخ اٹھا۔

''میرا پیر..... میرا...... بالکل ٹھیک ہو گیا۔''

''کیا ہوا بھیا۔''

''کچھ نہیں بہن۔ آج یہ پھر ثابت ہو گیا کہ اگر کوئی نیک کام کرے تو خدا اس کا اجر

ضرور عطا فرماتا ہے۔"

(۱۸)

لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ کر وہ اپنے گھر گیا اور چوکی پر لیٹ گیا۔ تھکاوٹ کے سبب اسے نیند آ گئی۔ باہر شور وغل سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر جا کر دیکھا تو ایک کسان کا بچہ تڑپ رہا تھا۔

"چلو اسے جلدی سے اسپتال کے کیمپ لے چلو۔"

"وہاں قطار میں دوا دیتے ہیں۔ بہت لمبی قطار ہے۔ تب تک بچہ مر جائے گا۔"

"میں چلتا ہوں... دیکھتا ہوں قطار کتنی لمبی ہے۔"

"قطار میں آؤ۔" کیمپ کے باہر چپراسی نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھیے۔ اس بچہ کی حالت بہت نازک ہے۔ قطار میں جتنے بھی مریض ہیں وہ سب انتظار کر سکتے ہیں لیکن یہ بچہ انتظار نہیں کر سکتا۔ مہربانی کر کے ہمیں پہلے اندر جانے دیجیے۔"

"جو آتا ہے یہی کہتا ہے۔ چپ چاپ پیچھے جا کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ....."

"ورنہ....." انور کے فوجی خون نے جوش مارا۔ چپراسی کے منہ پر ایک زوردار گھونسا پڑا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ انور بچے کو لے کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔

"اچھا ہوا تم اسے یہاں جلدی لے آئے ورنہ اس کی جان بچانی مشکل تھی۔"

"لیکن مجھ سے ایک گستاخی ہو گئی۔ آپ کا چپراسی ہمیں اندر نہیں آنے دے رہا تھا۔ فوجی ہوں نا اس لیے خون جوش مار گیا اور....."

چپراسی دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"ڈاکٹر صاحب.... یہ آدمی مجھے گھونسا مار کر اندر آیا ہے۔"

ڈاکٹر ہنستے ہوئے بولا "کوئی بات نہیں۔ بچے کی جان واقعی بہت خطرے میں تھی۔"

''او۔'' چپراسی واپس چلا گیا۔

''مجھے ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں۔''

''جاوید.....آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے کیپٹن انور کہتے ہیں۔''

''انور......مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ یہاں ڈیوٹی پر ہیں کیپٹن۔''

''نہیں میں یہاں چھٹیاں منانے آیا ہوں۔ یہ میرا ہی گاؤں ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ مجھے بھی آپ کے ساتھ گاؤں کی پہاڑیوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوگا۔''

''بالکل ڈاکٹر جاوید بالکل۔ اچھا پھر ملتے ہیں۔''

دوسرے دن انور ڈاکٹر جاوید سے ملنے گیا۔

''آیئے انور صاحب اور میرے ساتھ ریلوے اسٹیشن چلیئے۔ کچھ ڈاکٹر آرہے ہیں مجھے ان کو لینے جانا ہے۔''

''چلیئے۔''

ریل گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ جاوید نے کہا۔

''جانتے ہیں جاوید صاحب آپ ہی کا ہم نام میرا ایک بچپن کا دوست تھا جو بعد میں میرا عجیب سے رشتے کا بھائی بنا اور......''

''عجیب سے رشتے کا۔ میں سمجھا نہیں۔'' انور نے بیچ میں بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں دراصل اس کے والد اور میرے والد دوست تھے۔ اس کی ماں بھی نہیں تھی۔ پھر میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میری ماں اور اس کے والد نے آپس میں شادی کر لی۔ اس طرح ہمارے درمیان بھائی کا عجیب رشتہ جڑ گیا۔ جس کو کہ سوتیلا بھی شاید نہیں کہہ سکتے۔''

''اور......اور......'' انور نے درمیان سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جب ان دونوں کو اپنی اولاد ہوئی تو وہ انور اور جاوید پر ظلم ڈھانے لگے۔ ایک دن تنگ آکر وہ دونوں گھر چھوڑ کر چلے گئے اور اسی اسٹیشن پر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جاوید کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

(۱۹)

صبح صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ انور نے دروازہ کھولا۔ سپاہی نے سلیوٹ کیا۔

''سر آپ کا تار ہیڈ کوارٹر کو مل گیا۔ میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ آپ نے جس بہادری کے ساتھ چوکی کی حفاظت کی اور دشمنوں کو وہاں سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا، اس کے لیے آپ کو بہادری کا ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے پرسوں ہیڈ کوارٹر میں ایک بڑے جلسے کا انعقاد کیا گیا ہے۔ جس میں فوجی افسروں کے علاوہ سوسائٹی کے بڑے بڑے دولت منداور نامور لوگ شرکت کریں گے۔ ہمیں آج ہی روانہ ہونا ہے۔''

''اچھا..... تم میرا تھوڑا سا سامان باندھو تب تک میں اپنے دوست کو بتا کر آتا ہوں۔''

''جی سر۔''

جلسہ واقعی بہت شاندار تھا۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس اور فوج کے بڑے بڑے افسر موجود تھے۔ سب کی زبان پر انور کی بہادری کا چرچا تھا۔ نواب حسرت جنگ جن کا شمار شہر کے چوٹی کے رئیسوں میں ہوتا تھا، نے انور کو اپنی کوٹھی میں دعوت پر بلایا۔ دعوت میں اس قدر انکسار تھا کہ انور نا نہ کہہ سکا۔ نواب کے بارے میں اس نے کچھ لوگوں سے سنا تھا کہ انہوں نے ابھی کچھ سال قبل کسی کمسن کنواری لڑکی سے تیسری شادی کی ہے۔ حالانکہ نواب خود پچاس کے پار تھے۔ اس سے ان کی رنگین مزاجی کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن مجھے اس سے کیا۔ مجھے تو دعوت میں شرکت کرنی ہے اور واپس لوٹ آنا ہے۔ انور کی گاڑی کوٹھی کے دروازے پر پہنچی تو وہ حیران رہ گیا۔ کوٹھی کیا محل تھا۔ باہر سے جتنا خوبصورت اندر سے بھی اتنا ہی شاندار۔ نواب صاحب نے بہت سے لوگوں کو بلایا تھا۔ جب ان کی تیسری بیوی سے انور کا تعرف ہوا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی

پھٹی رہ گئیں۔

''نسرین۔''

نسرین نے اس کو اداس نظروں سے دیکھا۔لیکن نہ جانے وہ پھر کیوں مسکرانے لگی۔ پارٹی شباب پر تھی۔نواب صاحب دوسرے مہمانوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔نسرین موقع پا کر انور کے پاس آ گئی۔

''کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔تم کیسی ہو۔''

''بس مجبوری میں دن گزر رہے ہیں۔ایک بے بس لڑکی کیا کر سکتی ہے۔''

''تم نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا۔''

''میں ساری زندگی تمہارا انتظار کرتی لیکن گھر والوں کے آگے میری ایک نہ چلی۔ اپنی جھوٹی شان کی خاطر انہوں نے اس بوڑھے کو میرے پلے باندھ دیا۔تم بھی نہیں تھے کہ اپنے ساتھ مجھے لے جاتے۔میں کیا کرتی۔''

''تمہاری بات بھی درست ہے۔سب تقدیر کا کھیل ہے۔''

''ارے بھائی آپ ہماری نئی بیگم سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔''

''یہ آپ کی نئی بیگم سے باتیں نہیں کر رہے تھے۔میں ہی ان سے کہہ رہی تھی کہ رات کافی ہو چکی ہے،لہٰذا آپ ہیڈ کوارٹر جا کر نوکروں کو زحمت نہ دیں بلکہ ہمارے مہمان خانے میں رات گزار کر صبح چلے جائیں۔صبح ہونے میں کچھ گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔اس طرح ہمیں بھی کچھ گھنٹے اور آپ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہو جائے گا۔اور ویسے بھی اس کوٹھی کی روایت رہی ہے کہ یہاں مہمان آتا تو اپنی مرضی سے ہے لیکن جاتا ہماری التجا پر ہے۔''

''بالکل ٹھیک فرمایا بیگم۔انور صاحب آپ جیسی بہادر شخصیت کے ساتھ صبح کا ناشتہ بھی ہو جائے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔''نسرین نے درمیان میں بات کاٹی اور ایک نوکر کو بلایا۔

''انور صاحب کو پارٹی ختم ہونے کے بعد کوٹھی کے مہمان خانے کے خاص کمرے میں لے جانا۔ آج رات یہ یہیں رہیں گے۔ اور صبح ناشتے میں بھی خاص چیزیں بنانی ہیں۔ کیوں نواب صاحب۔''

''بالکل.... بالکل۔ انور صاحب اب تو بیگم نے آپ کے لیے کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔''

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انور نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ نسرین کمرے میں آ گئی۔

''تم۔ اس وقت۔''

''ہاں کیونکہ یہی وقت بہتر ہے۔ پوری کوٹھی گہری نیند میں سو رہی ہے اور کم از کم صبح سات بجے سے پہلے کوئی نہیں اٹھے گا۔ ہمارے پاس پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔''

''پرانی یادیں.....''

''وقت ضائع مت کرو۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لو جیسے لگاتے تھے۔ میرے جسم کے ایک ایک عضو کا رس چوس لو۔ مجھے مطمئن کر دو۔ میں آج تمہاری ہو جانا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر نسرین نے اپنے کپڑے اتار دیے اور دوڑ کر انور سے لپٹ گئی۔ انور اس کے گرم بدن کے احساس سے جل اٹھا لیکن اس کے سامنے رعنا کا چہرا آ گیا۔ اس نے نسرین کو دور کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نسرین۔ یہ گناہ ہے۔ اب تم کسی اور کی امانت ہو۔''

''امانت، کس کی۔ اس بوڑھے نواب کی جس نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے میری جوانی خرید لی اور پھر مجھے جوانی کی بھرپور لذت سے بھی ہمکنار نہ کر سکا۔ ہمیشہ مجھے پیاسی چھوڑ کر خود کنارے لگ جاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، وہ آج تک پورے طور پر میری عورت پن کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکا۔ میں اس سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ چلو جو ہم نے خواب دیکھے تھے اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیں۔'' وہ انور کے کرتے کے بٹن کو کھولنے لگی۔

''نہیں۔ یہ محبت کا رنگ نہیں ہوس کا رنگ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ تم یہاں سے جاؤ۔''

''میں تمہیں پا کر رہوں گی۔ اپنے جسم کی آگ بجھائے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' وہ پھر بری طرح انور سے لپٹ گئی اور اس کے اندر ہوس کے شعلوں کو بھڑکانے لگی۔ انور کے سامنے رعنا کا چہرا تھا۔ اس نے زبردستی نسرین کو اپنے سے الگ کیا اور پہلے اس کے کپڑوں کو پیر سے مار کر دروازے سے باہر کیا اور پھر نسرین کو برہنہ ہی باہر دھکیل کر دروازہ بند کرلیا۔

صبح نو بجے دروازہ پر پھر دستک ہوئی۔

''صاحب آپ کو نواب صاحب نے ناشتے پر بلایا ہے۔''

''چلو۔''

انور اور نواب حسرت جنگ کے درمیان ناشتے کے دوران خوب باتیں ہوئیں۔ نسرین کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ انور جب نواب سے جانے کی اجازت طلب کرنے لگا تو انہوں نے نسرین کو بلوایا۔

''بیگم۔ مہمان جا رہے ہیں۔''

''اچھا۔ خدا حافظ۔'' نسرین نے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے جسے نواب حسرت جنگ نہ دیکھ سکے۔

(۲۰)

ہیڈکوارٹر واپس آنے پر کرنل حیدر نے پوچھا۔

''کیوں کیپٹن ڈیوٹی کب سے جوائن کرنے کا ارادہ ہے۔''

''بس کچھ دنوں کی چھٹی اور چاہیے سر ابھی پیر ٹھیک ہونے میں کچھ کسر ہے۔ میں گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ جیسے ہی میں پوری طرح ٹھیک ہوا، ہیڈکوارٹر کو اطلاع دے کر ڈیوٹی پر آجاؤں گا۔''

''لیکن پھر بھی کب تک۔''

''سر زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے کمانڈنٹ کو حکم جاری کر دیتا ہوں کہ کیپٹن انور ایک ماہ کے اندر جب بھی آجائیں۔ ان کو ڈیوٹی جوائن کرنے کی اجازت دے دیں۔''

''بہت شکریہ سر۔''

ہیڈکوارٹر سے رخصت ہو کر وہ سیدھا اسپتال گیا۔ اب رعنا کی جدائی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''انور تم نے دیر کر دی۔ رعنا تمہارے غم میں بہت اداس رہتی تھی۔ وہ اپنا غم بھول جائے، اس لیے اسپتال کی ایک یونٹ کے ساتھ ملک کے مشرقی علاقوں میں جہاں کہ قحط پڑا ہوا ہے، وہاں گئی ہے۔ جیسے ہی وہ آجاتی ہے، میں تمہیں اطلاع کرتا ہوں۔ تم اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر وغیرہ لکھ کر دے دو۔''

(۲۱)

اکبر خان اپنے بیٹے کے آنے کا منتظر تھا لیکن وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے اپنے سب سے پرانے اور نمک خوار نوکر شمو کو بلایا۔

''شمو تم سارے حالات سے واقف ہو۔ تمہیں بتاؤ کیا میں نازوں سے پلی ہوئی زرینہ بیٹی کا ہاتھ اس کنگال جاوید کے ہاتھ میں دے دوں۔ جس کی نہ کوئی سوسائٹی ہے، نہ خاندان کا پتہ۔''

''نہیں سرکار۔ زرینہ بیٹی کی شادی تو کسی رئیس کے ساتھ ہونی چاہیے۔ جیسے کہ آپ کے بیٹے اقبال کے ساتھ۔''

''لیکن وہ کمبخت تو ولایت سے آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ زرینہ بٹیا بھی ادھر جاوید کے پیار میں ڈوبی ہے اور جاوید بھی جلد ہی قحط زدہ علاقوں سے واپس آنے والا ہے۔''

''کیوں نہ زرینہ اور اقبال کی سگائی کا اعلان کر دیا جائے کہ ولایت سے واپس آتے ہی اقبال اور زرینہ کی سگائی ہو جائے گی اور کچھ دنوں کے بعد شادی۔''

اکبر خان نے شمو کو زندگی میں پہلی بار گلے سے لگالیا۔

''شاباش شمو۔ آج سے تم خود کو میرا نوکر نہیں، دوست سمجھو۔''

زرینہ بھی یہ سب سن رہی تھی۔ دراصل اس دن کے بعد سے وہ اکبر خان کی نقل و حرکت پر سنجیدگی سے نظر رکھنے لگی تھی۔

''اوہ تو اب یہ شاطر چال چلی جا رہی ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔''

''چچا جان آپ کی صحت تو ٹھیک ہے۔ آج کل آپ زیادہ پریشان نظر آتے ہیں۔''

''نہیں تو بیٹی۔''

''آپ اپنا خیال رکھیں چچا جان۔ آپ کے علاوہ میرا اس دنیا میں کون ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں دوبارہ یتیم ہو جاؤں گی۔ آپ کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ بنا رہنا چاہیے۔''
یہ کہتے ہوئے اس نے اکبر خان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اکبر خان حیران رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی عیارانہ مسکراہٹ کو کام میں لاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ایسا نہیں ہوگا بیٹی۔ میرا سایہ تمہارے سر پر ہمیشہ رہے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں میرا اتنا خیال ہے۔''

''چچا جان وہ جو میری سہیلی ہے نا نکہت۔''

''ہاں۔ ہاں۔''

''کل اس کی شادی ہے تو اس نے مجھے اور نرملا کو آج ہی بلایا ہے۔ میں آپ سے اجازت لینے آئی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چلی جاؤں۔''

''ضرور جاؤ بیٹی۔ ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤ۔ منیم سے پیسے بھی لے لو۔ خوب دل کھول کر خرچا کرنا۔ نکہت کے گھر والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم اکبر خان کی بھتیجی ہو۔''

''شکریہ چچا جان۔''

وہ کار لے کر نرملا کے گھر پہنچی۔ نرملا اپنے گھر کے باہر تیار کھڑی تھی۔

''ارے یہ کار لے کر کیوں آئی ہو۔ کیا نکہت کا گھر شہر سے باہر ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ہی تو ہے۔ وہاں تک تو ہم پیدل چلتے ہوئے بھی جا سکتے ہیں۔''

''اصل میں چچا جان نے ڈرائیور کو ساتھ کر دیا ہے۔ یہ کل تک ہمارے ساتھ رہیں گے۔''

''ارے یار ہم نکہت کے ساتھ گھر میں شادی کی تیاریوں میں مصروف رہیں گے تو ڈرائیور صاحب کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظار کون دیکھے گا۔''

''تو پھر۔''

''میرے خیال میں تو اپنا سامان یہیں اتار لے۔ تھوڑا سا سامان ہے۔ ہم دونوں یہاں سے پیدل ہی چلتے ہیں۔ ڈرائیور صاحب پرسوں آ کر تجھے لے جائیں گے۔ ابھی تجھے

بھی تکلیف ہوگی اور ڈرائیور صاحب بھی شادی میں اکیلے رہ کر کیا کریں گے۔ سوائے بور ہونے کے۔ کیوں ڈرائیور صاحب۔"

"جی.....جی۔" ڈرائیور سوچ میں پڑ گیا۔

"تو پھر آپ جایئے اور پرسوں آ کر مجھے یہیں چھوڑ دیجیے گا اور زرینہ کو لے کر چلے جایئے گا۔ چچا جان کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم ابھی نکہت کے گھر جا کر انہیں ٹیلیفون کر دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"جی.......جی.....ٹھیک ہے۔"

ڈرائیور سامان اتار کر رخصت ہو گیا۔ زرینہ نے نرملا کو گلے سے لگالیا۔

"نرملا تم واقعی میری سچی سہیلی ہو۔ مجھے تم پر ناز ہے۔"

"اچھا.....اچھا.....یہ مکھن لگانا بند کرو اور یہاں سے جلدی نکلو۔ میں بھی اپنی نانی کے گھر جا رہی ہوں۔ اور ہاں.....جاوید جیجا جی سے میرا سلام کہنا۔"

زرینہ جاوید کی ماں کے پاس پہنچی اور اسے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کی ماں نے معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"بیٹی.....ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تم یہ برقعہ پہن لو۔ ہم ابھی پہلی گاڑی سے راکھن جائیں گے جہاں جاوید ڈیوٹی کر رہا ہے۔"

(۲۲)

انور راکھن جانے کے لیے ہیڈ کوارٹر سے نکلا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ اردلی نے سامان اس کی برتھ پر رکھا۔ اس کے سامنے والی برتھ پر ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان لڑکی تھی۔

''کہاں تک جانا ہے بیٹا۔''

''راکھن۔''

''کیا راکھن کے ہی رہنے والے ہو۔''

''ہاں۔ اور آپ۔''

''میں تو اپنے بیٹے سے ملنے جا رہی ہوں جو ڈاکٹر ہے اور وہاں قحط زدہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر جاوید۔ شاید تم اسے جانتے ہو۔''

''ڈاکٹر جاوید..... آپ شاید ڈاکٹر جاوید کی وہ ماں ہیں جنہوں نے اسے پالا ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم۔''

انور نے ساری داستان کہہ سنائی۔ ماں نے زرینہ کا تعرف کرایا۔

''اچھا تو میرا باپ لالچ میں آ کر میری چچیری بہن کی شادی نہیں ہونے دینا چاہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود جاوید اور زرینہ کی شادی کراؤں گا۔''

''بھائی جان.....'' زرینہ اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔

انور نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے باپ سے میں نپٹ لوں گا۔ اپنے بھائی پر بھروسہ رکھو۔''

''آپ چچا جان سے بات کریں گے۔ بھائی جان۔''

''ہاں باتیں تو مجھے ان سے بہت سی کرنی ہیں۔''

(۲۲۳)

ڈاکٹر جاوید بہت خوش تھا۔

''ماں جلد ہی یہاں کا کام ختم ہو جائے گا۔ ہمارے ساتھ ایک اور یونٹ بھی کام کر رہی ہے جس سے بیمار جلدی شفا پا رہے ہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ انور تم میرے ساتھ آ رہے ہو۔''

''چلو۔''

راستے میں جاوید نے انور سے کہا۔

''یار تو میرا بھائی بھی ہے، دوست بھی اور اب میرا سالہ بھی ہونے جا رہا ہے لیکن میں سوچتا ہوں جب تمہارے سگے اور میرے رشتے کے والد سے سامنا ہوگا تو کیا ہوگا۔''

''ابے کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہوں نا۔ اب تیری شادی کے بارے میں غور کرنا ہے۔ چل تیرے کیمپ چل کر چائے کی پیالی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں کہ شادی یہیں ہو جائے یا یہاں سے واپس جا کر۔''

''وارڈ بوائے کہاں ہے۔''

''جی وہ کام سے گیا ہے۔''

''اوہ۔''

''کوئی کام ہے سر۔''

''ہاں اصل میں کینٹین سے چائے لانی تھی۔ لیکن آپ دوسرے یونٹ کی ہیں تو......''

''کوئی بات نہیں سر۔ میں لے آتی ہوں۔ آخر آپ بھی تو ڈاکٹر ہیں اور خدمت کرنا تو

میرا فرض ہے۔"

"اوہ شکریہ سسٹر۔ دو چائے میرے کیمپ میں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔"

انور اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ نرس چائے لے کر آ گئی۔

"رعنا..... تم..... اوہ خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" وہ کرسی سے اٹھا اور رعنا کو اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑ کر اسے بے تحاشا چومنے لگا۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے انور۔"

"ارے یہی تو ہے میری زندگی۔ میری رعنا۔"

"ہاں ڈاکٹر جسے یہ رات کی تنہائی میں اکیلا چھوڑ کر بزدلوں کی طرح بھاگ گئے تھے۔"

"اوہ رعنا۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے لگتا ہے خدا کی یہی مرضی تھی۔ دیکھو وہاں سے نکلنے کے بعد مجھے عقل آ گئی۔ یہ دیکھو خدا نے میرا پیر بھی ٹھیک کر دیا اور مجھے میرا بھائی بھی مل گیا۔ آج خدا نے تم سے بھی ملا دیا۔ میں تمہارے اسپتال سے ہی آ رہا ہوں۔ وہاں میں نے اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر بھی چھوڑا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تم یونٹ کے ساتھ قحط زدہ علاقوں میں گئی ہو اور دیکھو تمہاری خدمت اور میرے نیک کاموں کا صلہ خدا نے یہ دیا کہ تم مجھے مل گئیں۔"

رعنا اس کے گلے سے لپٹ گئی اور زار و قطار کر رونے لگی۔

"میری تو دنیا ہی ویران ہو گئی تھی۔ آپ اس طرح مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اچھا آپ کا بھائی کون ہے۔"

"میں ہی اس کا بھائی ہوں سسٹر۔ اوہ..... ہونے والی بھابھی۔"

رعنا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انور نے کہا۔

"تم ڈیوٹی ختم کر لو۔ پھر گھر چلیں گے۔ وہاں تمہیں جاوید کی ہونے والی بیوی اور ماں سے بھی ملنا ہے۔ اور میں تمہیں ساری بات بھی بتاؤں گا۔"

(۲۴)

ڈرائیور تیسرے دن زرینہ کو لینے پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی شادی نہیں تھی۔ وہ گھبرا گیا اور واپس آ کر سارا واقعہ اکبر خان کو سنایا۔

''اوہ تو یہ اس کی چال تھی۔ اتنا بڑا دھوکہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دولت تو ہاتھ سے سرکتی جا رہی ہے۔ میں کیا کروں.... شمو....'' تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''ارے اقبال بیٹا تم.... بہت اچھے وقت پر آئے بیٹا۔ مجھے تمہاری بڑی ضرورت ہے۔ یہ تمہارے ساتھ لڑکی کون ہے۔ اچھا تمہاری کوئی دوست ہے جو یہاں گھومنے آئی ہے۔''

''نہیں پاپا۔ یہ آپ کی بہو اور میری بیوی ہے۔ اس کا نام کٹی ہے۔ میں نے اس سے ولایت میں ہی شادی کر لی ہے۔''

اکبر خان کا سر چکرا گیا۔ وہ صوفہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اف..... یہ کیا ہو گیا۔ اس لڑکے نے تو سارے راستے ہی بند کر دیے۔''

''کیا ہوا پاپا۔ زرینہ کہاں ہے۔''

''کچھ نہیں بیٹا۔ ذرا طبیعت خراب ہے۔ زرینہ اپنی سہیلی کی شادی میں گئی ہے۔ تم اور بہو جا کر آرام کرو۔ کھانے کے وقت باتیں کریں گے۔''

''جی پاپا۔''

اکبر خان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ قسم قسم کے خیال اس کے دماغ کو گھیرنے لگے۔ کہیں یہ اس کے گناہوں کی سزا تو نہیں۔ انور اور جاوید..... ہاں جاوید..... ڈاکٹر جاوید.... کیا وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے شمو کو بلا کر سر دبوایا۔ کچھ دماغ قابو میں آیا تو وہ معاملے پر نئے سرے سے غور کرنے لگا۔

کھانے کی میز پر اقبال نے کہا۔

''پاپا کٹی کہتی ہے کہ آپ کے ابو بالکل آپ کی طرح ہیں۔''

''ہاں.....جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی پاتا ہے۔'' اکبر دھیمے سے بڑبڑایا۔

''کیا کہا پاپا۔''

''کچھ.....کچھ نہیں بیٹا۔ اچھا اب تم بتاؤ۔ شادی کی اتنی جلدی بھی کیا تھی۔ خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ بہو ولایت چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے آگئی ہے۔ چلو اب تم یہاں کوئی بڑا کاروبار شروع کرو۔ زرینہ بھی آجائے تو......''

''نہیں پاپا.... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ کٹی یہاں ہمیشہ کے لیے رہنے نہیں آئی ہے۔ وہ تو بس یہاں گھومنے آئی ہے۔ کچھ دن کے بعد واپس چلی جائے گی۔ ہم آپ کو دیکھنے کے لیے سال دو سال پر آتے رہیں گے۔ اصل میں وہاں پر بھی میرا کاروبار ہے۔ میرا کیا کٹی کا ہی کاروبار ہے۔ اب ہم دونوں اسی میں مصروف رہتے ہیں۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی سال میں ۲۔۳ بار ولایت کے چکر لگا لیا کروں گا۔ تم لوگ بھی ایک دو بار یہاں آجاؤ گے تو کافی دن ہم ساتھ ہی رہ سکتے ہیں۔''

''جی.....وہ.....'' کٹی نے اسے بیچ میں ہی ٹوکا اور انگریزی میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ اقبال نے بھی اس کا جواب دیا۔ کٹی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے پھر انگریزی میں جواب دینا شروع کیا۔ اس بار اس کا لہجہ کچھ سخت اور پریشان کن لگ رہا تھا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔''

''جی وہ ایسا ہے پاپا کہ آپ ولایت آکر بور ہو جائیں گے۔ دراصل ہمارا کام ایسا ہے کہ میں اور کٹی صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک کام کرتے ہیں۔ اس کے بعد ولایت کی روایت کے مطابق دل بہلانے کے لیے دیر رات تک کلب اور پارٹی کا لطف لیتے ہیں۔ رات میں زیادہ دیر تک جاگنے کے سبب صبح آٹھ بجے سو کر اٹھتے ہیں اور نو بجے پھر کام پر لگ جاتے ہیں تو اس طرح ہفتہ میں چھ دن تو ہم آپ کو وقت ہی نہیں دے سکیں گے۔ ہفتہ میں ایک دن چونکہ آرام کا دن ہوتا ہے۔ اس لیے اس دن آرام بھی بہت ضروری ہے۔ تو اسی دن ہم آپ کو

ایک دو گھنٹے کا وقت دے سکیں گے۔ تو کٹی سمجھتی ہے کہ آپ ولایت میں بور ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں، ہم سال میں ایک دو بار ضرور یہاں آنے کی کوشش کریں گے۔''

اکبر خان کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بار بار اس کا ذہن ماضی کی یادوں میں کھو جاتا۔

''پاپا۔ زرینہ کب آئے گی۔''

اس سوال سے اکبر خان تھوڑا گھبرا گیا لیکن خود پر قابو رکھ کر بولا۔

''بیٹا تمہارے آنے سے کچھ ہی گھنٹوں پہلے وہ دکن کے لیے نکلی تھی۔ ۲ دن تو پہنچنے میں لگے ہوں گے۔ اب شادی ہو جائے گی تو میں سمجھتا ہوں ایک ہفتے کے اندر اسے واپس آ جانا چاہیے۔''

''تب تو بہت مشکل ہے۔''

''کیا مشکل ہے۔''

''اصل میں پاپا۔ کٹی نے چار دنوں میں یہاں کافی کچھ گھوم لیا ہے۔ ہم جلدی میں چلے بھی آئے تھے۔ وہاں کاروبار بھی دیکھنا ضروری ہے اس لیے کٹی نے کل کی واپسی کی ٹکٹیں کرالی ہیں۔ ہمیں کل صبح ہی واپس جانا ہے۔''

''اتنی جلدی۔''

''ہاں پاپا۔ مجبوری ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ہم بہت جلد آپ سے دوبارہ ملنے آئیں گے۔''

اکبر خان اپنے بیٹے اقبال کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔

(۲۵)

جاوید اور زرینہ اور انور اور رعنا کی شادی راکھن میں ہی ہونی قرار پائی۔ جاوید کی ماں کو خوف تھا کہ کہیں اکبر خان کوئی دوسری چال نہ چل جائے ،اس لیے جلدی سے جلدی شادی کی خواہش مند تھی۔ دونوں کی شادی ہوگئی اور یہ دونوں نئے جوڑے اپنی زندگی کی منزلوں کی جانب سفر کرنے لگے۔ ۲۰ دن ہو گئے۔ انور کو ڈیوٹی کی یاد آئی۔ جاوید کا کیمپ بھی جا رہا تھا۔ قحط ختم ہو چکا تھا۔ سب واپس آ گئے۔ دو دن کے بعد زرینہ نے جاوید سے کہا۔

''چچا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ مجھے ان کی فکر ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ پھر اب میں اپنے والد کی اتنی بڑی جائداد کی مالک ہوں۔ ہمیں وہاں جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں انور کو بھی تیار کرتا ہوں'' شام کو وہ انور سے ملا اور ساری بات بتائی۔

''ٹھیک ہے چلو۔ مجھے بھی اپنے باپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

چاروں دوسرے دن صبح حویلی پہنچے۔ حویلی میں شور و غل تھا۔ شمو اور چار نوکر اکبر خان کو پکڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سامنے بیٹھا تھا۔ دو وکیل بھی تھے جو آپس میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے۔

''چچا..... کیا ہوا۔ شمو کاکا.... کیا ہوا چچا کو۔''

''تم آ گئی بیٹی۔ بہت اچھا ہوا'' دونوں وکیلوں نے بھی جب زرینہ کو دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا۔

''ہوا کیا ہے۔''

شمو نے اقبال اور کٹی تک ساری داستان کہہ ڈالی۔ ''اب انہیں جب بھی دورہ پڑتا

ہے یہ چلانے لگتے ہیں۔ یہ مکان میرا ہے۔ یہ دولت میری ہے۔ یہ کاروبار میرا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

انور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''قدرت کا انصاف ہو کر رہتا ہے۔''

دونوں وکیل زرینہ کے پاس آئے۔

''وکیل چاچا آپ لوگ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں۔''

''بیٹی ہمیں بڑی فکر تھی کہ تم کہاں چلی گئی۔ تمہارا کوئی پتہ ٹھکانا بھی نہ تھا۔ ہم تو اخبار میں اشتہار دینے والے تھے لیکن خدا کا شکر کہ تم واپس آگئی۔ اب کہیں مت جانا۔ اپنے والد مرحوم کی جائداد سنبھالو جنہوں نے بڑی محنت و مشقت سے اتنا بڑا کاروبار پھیلایا۔ اس کو ضائع مت ہونے دینا۔ ہم تمہارے والد کے اس دور کے ساتھی ہیں جب وہ مزدوری کرتے تھے۔''

''نہیں چاچا۔ میں اپنے والد کی محنت و مشقت سے بنائے ہوئے کاروبار کو خود چلاؤں گی۔ اسے کسی بھی حال میں نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔'' زرینہ نے جاوید اور انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے ان کو انجکشن دے دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے بیٹی کہ اب یہ تمہاری سرپرستی کے قابل نہیں رہے۔ نہ جانے ان کو کون سا صدمہ لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ مرض ان کی حیات کے ساتھ ہی جائے گا۔''

''چچا کی سرپرستی نہیں رہی تو کیا ہوا۔ میرے چچیرے بڑے بھائی کی سرپرستی تو ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔''

''وکیل چاچا۔ شمو کاکا۔ آپ انہیں جانتے ہیں۔ یہ کیپٹن انور ہیں جن کو بہادری کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ اکبر چچا کے بیٹے اور میرے سرپرست میرے بڑے بھائی ہیں۔'' زرینہ نے مضبوطی سے انور کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''واہ.... یہ تو بہت اچھا ہے بیٹی میں ابھی آپ لوگوں کا کمرا سجواتا ہوں۔ آپ لوگ آج سے یہیں رہیں۔ حویلی بھی خوشحال رہے گی اور بیٹا انور تمہیں اپنے والد کی خدمت کا موقع

بھی ملے گا۔"

"ہاں....اب تو بس یہی کرنا باقی ہے۔" انور نے ٹھنڈی سانس لی۔ جاوید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اپنے ساس سسر کی خدمت کا موقع تو خوش قسمت لڑکیوں کو ملتا ہے۔ ساس کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اب اپنے سسر کی خدمت میں کوئی کمی نہ رکھوں گی۔"

"شاباش میری اچھی بھابھی۔" زرینہ رعنا سے لپٹ گئی۔ انور اس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

(۲۶)

اکبر خان کے دورے بڑھتے گئے۔ ایک ایک دو دو گھنٹے پر اس کو دورے پڑنے لگے۔ وہ بری طرح چیختا۔ اس کے دماغ نے ماضی اور حال سب کو ایک کر دیا تھا۔ کبھی کہتا۔

''یہ مکان، یہ کاروبار، یہ دولت یہ سب کچھ میرا ہے۔ مجھے اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

کبھی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے۔

''ارشد میرے دوست۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں تم سے کیا ہوا وعدہ نہیں نبھا پایا۔ میں نے تیرے بچے پر بڑا ظلم کیا، اپنے بچے پر بڑا ظلم کیا۔ جاوید.... انور تم کہاں ہو میرے بچوں۔ باپ نے تمہیں چھوڑ دیا تو کیا تم بھی باپ کو چھوڑ دو گے۔ تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے گھر سے جانے کے بعد تمہاری ماں کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ جاوید وہ تمہیں یاد کرتے کرتے ایڑی رگڑ کر مری۔ وہ آخر تک چیختی رہی کہ میرے جاوید کو لاؤ لیکن میں تمہیں تلاش نہ کر سکا۔ میرے بچوں تم کہاں ہو۔ سب میرے گناہ ہیں۔ اوہ خدایا مجھے موت کیوں نہیں آتی۔''

کبھی دورہ پڑنے پر وہ چیخ چیخ کر یہ کہتا۔

''ارشد۔ میرے دوست۔ تم نے مجھ سے یہ وعدہ کیوں لیا کہ میں تمہاری بیوی سے شادی کر لوں۔ بتاؤ کیا اس سے پہلے میں تمہاری اولاد کو اپنی اولاد نہیں سمجھتا تھا۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ مگر تم اپنا وعدہ ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا دوست بالکل اکیلا...... جانتے ہو..... رقیہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میرے بچے جاوید اور انور چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے سب پر ظلم کیا۔ میں بہت بڑا گنہگار

ہوں۔"

رعنا بالکل بیٹی کی طرح اس کی خدمت کرتی۔ زرینہ جب آفس سے آتی تو اس کے پاس بیٹھتی۔ جاوید اور انور جب اسے اس حالت میں دیکھتے تو خون کے آنسو روتے۔ جاوید اور انور کے سامنے جب اکبر خان کو دورہ پڑتا اور وہ ارشد، رقیہ اور اپنے دونوں بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آہ وزاری کرتا اور خود کو ظالم کہتا اور معافی مانگتا تو دونوں کے دل پھٹ جاتے اور وہ اکبر خان کے پیروں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ لیکن اکبر خان ان سب سے بے نیاز چیخنے میں لگا رہتا۔ وہ دونوں سب کچھ بھول گئے تھے۔ اس کے گناہوں کو بھول گئے تھے۔ اب ان کے سامنے اکبر خان ایک باپ تھا جس کا احترام اور تیمارداری ان پر فرض تھی۔ اکبر خان کے دورے بڑھتے گئے۔ ۲ ڈاکٹر اور دو نرسیں مستقل حویلی میں رہتیں۔ اکبر خان کا ہر طرح کا علاج جاری تھا لیکن حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی ہی جا رہی تھی۔

اب آہ وزاری والی کیفیت لگاتار بڑھ رہی تھی۔ اس کی یہ حالت اب کسی سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس کے منہ سے ندامت کے ایسے ایسے الفاظ نکلتے جو کہ پتھر کو بھی پگھلا دیں۔ ایک شام انور، جاوید، زرینہ اور رعنا نے اکبر خان کی حالت پر سنجیدگی سے غور کیا اور کچھ فیصلہ کیا۔ وہ شب جمع تھی۔ اس رات چاروں نے خوب خدا کی عبادت کی اور اس کی بارگاہ میں رو رو کر التجا کرتے رہے۔

"الٰہی تو بڑا کریم ہے۔ ہمارے والد اکبر خان کو بخش دے۔ ان کو اس اذیت ناک مرض سے نجات دے دے۔ اے ہمارے رب ہم نے ان کو معاف کیا۔ ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں۔ ارشد اور رقیہ کو بھی اب ان سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اے ہمارے رب تو بھی انہیں معاف کر دے۔ ان پر رحم کر ہمارے مالک۔ ہمارے والد کو ان اذیتوں سے نجات دے۔" رات بھر عبادت اور دعاؤں کے بعد وہ سب نماز فجر ادا کر کے اور قرآن پاک کی تلاوت کر کے تھوڑا آرام کرنے کے لیے سو گئے۔ ۲ گھنٹے بعد ہی شمو دوڑتا ہوا آیا۔

"بچوں.....اکبر خان صاحب کا انتقال ہو گیا۔"

MAAZI AUR HAAL

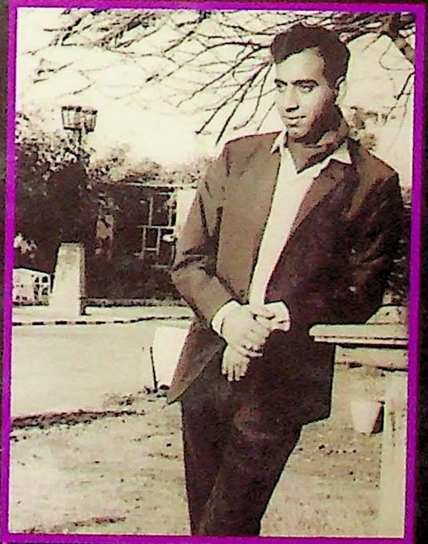
(Novel)

Vehshi Syed

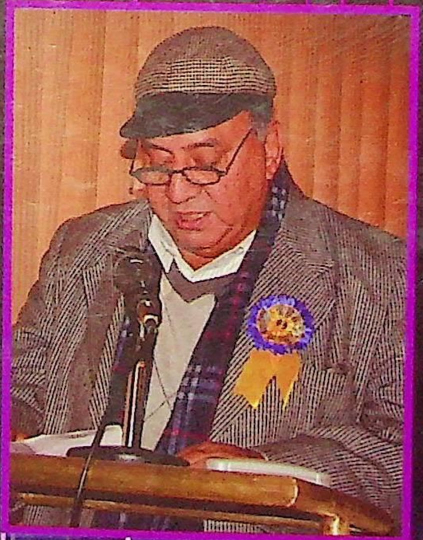
ماضی

اور

حال



1964



2015

Tahreek-e-Adab
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.) INDIA
Cell: 0091 - 993-595-7330
e-mail: jaweanwar@gmail.com